ترقی پسند ادب کا ترجمان

انگارے

مرتبہ

سیّد عامر سہیل

ماہانہ کتابی سلسلہ نمبر ۳۵

تیسرا سال: گیارہویں کتاب

نومبر ۲۰۰۵ء

مراسلت: c/۵۴۵ گل گشت کالونی، ملتان
ای میل: angarey_90@hotmail.com
ویب سائٹ: www.apwn.net/urdu
فون: ۰۶۱-۶۵۲۳۴۸۶ ، ۰۳۰۰-۹۶۳۸۵۱۶

مطبع: عاتکہ پرنٹنگ پریس، ملتان
قیمت: تیس روپے
زرِ سالانہ (بارہ شمارے): ۳۵۰ روپے

ترتیب

۱۔ چند باتیں	سید عامر سہیل	۳
مضامین:		
۲۔ کوزہ گر صابر ظفر	پروفیسر ریاض صدیقی	۴
۳۔ ظفر اقبال کی شاعری کے تین رخ	ڈاکٹر عارف ثاقب	۱۰
۴۔ پروین شاکر: کشفِ ذات سے ادراکِ خیات تک	ڈاکٹر روبینہ رفیق	۱۵
۵۔ مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید کے مقام کا تعین	گیری پوٹر اور جوزلوپز/نسیم عباس	۲۱
۶۔ جمالیاتی کیفیات کا شاعر	فہیم شناس کاظمی	۲۵
۷۔ تحقیق پر تنقیدی رویے کی سمت	ایم۔ خالد فیاض	۲۸
۸۔ انیس ناگی کی نظم میں وجودی اصطلاحات	تنویر صاغر	۳۴
دس غزلیں (صفدر سلیم سیال):		
۹۔ دس غزلیں	صفدر سلیم سیال	۴۰
کہانیاں:		
۱۰۔ پیاس ہی پیاس (سندھی کہانی)	اخلاق انصاری/ننگر چنا	۴۶
۱۱۔ ٹیکسی سٹینڈ	لیاقت علی	۵۰

غزلیات:

۱۲۔ صابر ظفر (ایک غزل)، ڈاکٹر انور سدید (دو غزلیں)، خاور اعجاز (چھ) افضل گوہر (دو)، حصیر نوری (دو)، فہیم شناس کاظمی (دو)، شارق بلیاوی (دو)، کاشف مجید (دو) اوصاف نقوی (دو)، شہاب صفدر (دو) سجاد مرزا (دو) ۔۔۔ ۵۱ تا ۷۳

نظمیں:

۱۴۔ آج کے شاعر (سجاد مرزا)، اور جینے کو/ ایک چٹکی بھر نظم (فہیم شناس کاظمی) بہشتِ ارضی لہولہو (محمد فیروز شاہ) گدھ (ڈاکٹر جاوید اختر) ۔۔۔ ۷۴ تا ۷۶

حروفِ زر

۱۲۔ قارئین کے خطوط	بنام مرتب	۸۹

سید عامر سہیل

چند باتیں

خواب دیکھنے اور اپنی خوش فہم آنکھوں پر اعتبار کرنے والے اکثر ان خوابوں کی بربادی کا خمیازہ بھگتتے ہیں، اپنے عہد کے خرابے پر بیٹھے گزرے دنوں کو یاد کرنا شاید ہمارا وطیرہ ہے۔ سوال آمادہ سماجی اور ادبی ڈھانچے سے ماضی کی راکھ کو کریدنے کا کام ہم میں سے اکثر شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں تاہم کچھ ایسے بھی ہیں (جن کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے) جو صرصر کو صبا اور ظلمت کو ضیا کہنے کی دربارداری اور قصیدہ گوئی سے دُور ہیں اور جو حقیقت کو کھلی آنکھ سے دیکھتے اور بلند آہنگ لہجے میں بیان کر دینے کا ہنر رکھتے ہیں۔

ادبی منظرنامے میں ادیبوں اور شاعروں کے باہمی تعلقات اور ان تعلقات کو دوام بخشنے کی خواہش میں جو علمی بے اعتدالیاں رونما ہوتی ہیں وہ اکثر نئے لکھنے اور پڑھنے والوں کے لیے زہرِ قاتل ثابت ہوتی ہیں۔ شخصیات کو عظیم تر بنانے اور ان کے گرد تقدس کا ہالہ بُننے میں کمزور دل اور کمزور قلم لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ سو، ہمارے عہد کے 'اکثر بڑے' انھی کمزور دل اور کمزور قلم لوگوں کے ہاتھوں عظیم تر بنتے یا بننے کا خواب دیکھتے ہیں اور اس کا خمیازہ ہم جیسے ادنیٰ لوگوں اور قارئین کو بھگتنا پڑتا ہے۔

ہمارے ادبی حلقوں میں رائے دینے اور رائے قائم کرنے کے بھی کئی طریقے وضع ہو رہے ہیں۔ خود کو معاشرے کا اجتماعی ضمیر کہلوانے والے اکثر اپنے ضمیر کی آواز سننے سے عاری ہوتے ہیں۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے اور بدنصیبی کہ دعویٰ کرنے والا خود اس دائرے سے باہر رہ کر اندر کی خبر لاتا ہے۔ ادبی رسائل، اخبارات اور جرائد میں اکثر اِسی انداز کی آرا کو قائم کیا جاتا ہے۔ مدیر اور مرتب حضرات اپنے جریدے کی بقا کے لیے دوسروں سے سانسیں اُدھار لینے، اپنے ہم وطنوں سے جو کہ اب غیر ملکی بن چکے ہیں، رَسد وصول کرنے اور کسی صاحبِ ثروت کو صاحبِ کتاب بنانے ایسے 'ادبی کارنامے' اکثر سرانجام دیتے ہیں۔ دسترخوانوں کو سمیٹنے والے، ادبی شخصیات اور رویوں کے بارے میں جو رائے اپنے رسائل میں قائم کرتے ہیں وہ یقیناً بے اعتدالی، عدم توازن اور ناہمواری پر مبنی ہوتی ہے۔ اسی طرح سچ کو جھوٹ کہنے یا جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کی روش عام ہے۔ نیز، بڑوں کے بڑے ہونے اور بڑے پن کی آزمائش بھی انھی حالات میں دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔

اس سارے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ اب رسائل و اخبارات، رنگین ٹائٹل، چمکدار صفحات اور اعلیٰ درجے کی چھپائی سے تو مزین ہوتے ہیں مگر ان میں سچائی، صداقت، جرأت، توازن اور اعتدال کا عنصر شاید ہی دکھائی دیتا ہے۔ یہ خواب دکھانے والے اور خوش فہم آنکھوں پر یقین کرنے والے لوگ ہیں مگر اِن کے دکھائے خوابوں کا خمیازہ ہم ایسے ادنیٰ لوگوں اور قارئین کو بھگتنا پڑتا ہے۔

پروفیسر ریاض صدیقی

کوزہ گر صابر ظفر

ہم اور آپ ہمہ وقت مختلف تجربوں اور واقعات کی بھیڑ سے گزرتے رہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں اور پھر کسی نہ کسی ردعمل کا اظہار بھی۔ اس عمل میں جملہ سازی کی ان گنت قسمیں بنتی ہیں حتیٰ کہ گالی بھی اس کی ایک قسم ہے جس کی معنویت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اظہار کی ان ان گنت قسموں میں سب سے لطیف تر، نازک اندام، رنگین و شفاف اور دریائے معنی کو کوزے میں بند کرنے جیسی قسم بیان شاعری ہے۔ شاعری ایک طرح کی فن کیمیا گری ہے کیونکہ شاعر یعنی اچھا ہنرمند شاعر تجربوں اور مشاہدوں کے کل کثیف مواد کی کشید سے اصل جوہر حاصل کرتا ہے۔ بقول غالب لطافت بے کثافت جلوہ پرور ہو نہیں سکتی۔ ہمیں صابر ظفر کی شاعری پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کیمیا گری کا ایسا مشکل فن ان کی فطرت میں شامل ہے۔ ان کے شائع ہونے والے شعری مجموعوں کے آخری چند میں بہ شمول زیرِ نظر تازہ شعری مجموعہ ''پرندوں کی طرح شامیں'' انھوں نے مقبولِ عام رواں و مترنم بحروں کے مقابلے میں نئ اور کسی حد تک طویل بحروں سے معاملہ کیا ہے۔ کچھ طویل مسلسل غزلیں بھی ان مجموعوں میں شامل ہیں۔ یہاں ایک اور رنگ جو ہمیں دکھائی دیتا ہے وہ کچھ ایسی جہتوں کا مشاہدہ ہے جن کی طرف عموماً شاعروں کی نظر جاتی نہیں ہے یا وہ ان کے حوالے سے معنی کی کسی سماجی و تہذیبی مرکزیت کا تعین نہیں کر پاتے ہیں۔ اس تناظر میں تکیوں، درگاہوں اور خانقاہوں کے مشاہدے سے صابر ظفر نے جن معنوں کی نشاندہی کی ہے وہ ان کے اپنے نقطہ نظر اور عام اکثریت کے ساتھ ان کی جڑت پر دلیل ہیں۔

تکیے درگاہیں خانقاہیں
دنیا کی یہ رہ گئیں پناہیں
جن کو ملے رہ نما نہ کوئی
ان کو لئے پھرتی ہیں یہ راہیں

خاردار تاروں کا بچھنا ایک ایسا منظر ہے جس کا مشاہدہ کرنے والا اس سے کوئی تاثر قبول کئے بغیر گزر جاتا ہے۔ شاعر نے اس مشاہدے کا پرندوں کی اجتماعی حسیت کے ساتھ تعلق قائم کر کے جو معنی کشید کیے ہیں۔

بچھنے لگیں خاردار تاریں
ہونے لگے اجنبی پرندے

ان پر غور کریں کہ قدرتی ماحولیات ہی کے تناظر میں زندہ جسموں کے رہن سہن کی عادتیں یعنی Habitat متعین ہوتی ہیں جن کو مصنوعی ذرائع سے اگر تبدیل کر دیا جائے تو ان زندہ جسموں کی زندگی

پر زد پڑتی ہے، ان کی افزائش نسل کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور کسی مرحلے پر ان کی نسل ناپید ہو جاتی ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ صنعتی و ٹیکنالوجیکل دور میں خود انسانوں کے ہاتھوں قدرتی ماحول میں ضرورت سے کہیں زیادہ مداخلت نے کرہ ارض پر انسانی زندگی کے وجود کو چیلنج کر دیا ہے۔

زرخاک چھیننا اور پھر اس کو اُجاڑنا
یہ سب اہلِ خاک ہی کا ہے شر میرے کوزہ گر

زیرِ نظر شعری مجموعے کی اکثر طویل البحر غزلوں میں حقائق کی ایک کہانی ہے جو اشعار کی میموری میں موجود اور پڑھنے والے کی کمان کے لئے چشم براہ ہے بشرط کہ پڑھنے والے کو کمان (Command) کے گُر آتے ہوں۔ رازِ نہاں کی تسخیر کا ایک لطیف احساس صابر ظفر کے اس تازہ شعری مجموعے میں دستک دیتا ہے۔

شکاری دیکھے صحرا میں کوئی مشکی ہرن جیسے
میں ایسے دیکھنا چاہوں کسی رازِ نہاں کے پار

اصل میں ''پرندوں کی طرح شامیں'' کی تحریک کا مرکز شام کو اُڑان کی یاترا سے واپس آ کر درختوں پر بسیرا کرنے والے پرندے ہیں۔ اسی منظر سے شعری مجموعے کا نام بھی اخذ کیا گیا ہے۔ پرندے کی علامت کو شاعر نے اپنی چار غزلوں میں بطور ردیف بھی استعمال کیا ہے۔ معنی کی توسیع و ترسیل کے لئے خاص قسم کی ردیفوں کا چناؤ بھی صابر ظفر کی شاعری کا ایک قابل ذکر پہلو ہے۔ ان غزلوں کے اشعار میں پرندے کی وساطت سے معنوں کی مختلف تہیں بنی ہیں جن میں معاصر سماج کے منفی رویئے بھی شامل ہیں۔

ملتے ہیں ظفر کہ جب غرض ہو
جیسے ہوں وہ موسمی پرندے

زیرِ نظر شعر میں حیاتیاتی علامتوں کے ذریعہ کسی سنگین خطرے بچاؤ کے اس احساس کی نشاندہی ہوئی ہے جو صرف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ ہر جاندار میں موجود ہوتا ہے اور وہ اپنی اور اپنی نسل کی زندگی کا ایک اپنا دفاع نظام وضع کرتا ہے۔

پناہ کیسی کہ پیڑوں میں سانپ گھوم رہے ہیں
سو گھونسلے سے کہیں دور جا چھپا ہے پرندہ
ادھر اب آئیں تو کیسے اور آ کے گائیں تو کیسے
کہ دیکھتے ہیں تیرے گلشنوں میں جال پرندے

دو مزید حسی پہلو جو زیرِ نظر شعری مجموعے میں اُبھرتے ہوئے شوخ رنگوں کے ساتھ نمایاں ہوئے ہیں۔ اوّل ماورائے مکان لامکاں سے ربط قائم کرنے کی کوشش، گماں میں حقیقت کے کسی پرتو کی تلاش اور دوم صوفیانہ ادراک تک رسائی ہے۔

دھنک اوڑھے ہوئے جاتا ہے کوئی آسماں کے پار
سواگت کے لئے اک روشنی ہے کہکشاں کے پار
خدا جانے وہاں کیوں پھر تمنا ہے سکونت کی
اگرچہ اک نمایاں بے مکانی ہے مکاں کے پار
رواں ہوں صورتِ سیماب اپنی اصل کی جانب
حقیقت کا کوئی پرتو یقیناً ہے گماں کے پار

تصوف کے حوالے سے اساتذہ کا یہ مفروضہ کہ۔

تصوف برائے شعر گفتن خوب است یعنی شعر کہنے کے لئے تصوف خوب ہے انسانیت کی رہنمائی کرنے والے ایک جامع نظریئے کی تردید کے مترادف ہے۔ یہ نظریہ مکان کی نفی کر کے لامکاں کا اثبات نہیں کرتا ہے جیسا کہ عموماً اس کے بارے میں تاثر پھیلایا گیا ہے۔ جس نظریئے میں عشق مجازی کے مراحل سے گزرے بغیر عشق حقیقی کی منزل تک پہنچ ناممکن ہو اور کسی نسل و رنگ علاقے اور عقائد کا فرق کئے بغیر بندے سے رشتے کو ترجیح دی گئی ہو وہ مادی عالم کی نفی کیونکر کر سکتا ہے۔ سماجی حوالے سے تصوف کا نظریہ نمایاں حد تک ترقی پسندانہ ہے کیونکہ وہ ایک ناطبقاتی سیکیولر سماج کی وکالت کرتا ہے، پوری انسانیت کو عالمگیر برادری کے تناظر میں دیکھتا ہے اور مساوات کے لئے اخلاقی نہیں اقتصادی شرط کا اطلاق کرتا ہے۔ اس میں وحدت الوجود وحدتِ ادیان کے ساتھ مشروط ہے۔ صابر ظفر کے یہاں بھی وجود مطلق کا وہ اثبات ضرور ہوا ہے۔

مجھے جس حال میں رکھے میرے معبود کی مرضی   نظر تو جا رہی ہے اک جمالِ جاوداں کے پار
صحرائے دہر میں گلِ خنداں ترا وجود   حسرت سے دیکھتے ہیں غزالاں ترا وجود

لیکن زندگی اور سماج سے نظریہ تصوف کے کمٹ منٹ کا منظر ان کی مختلف غزلوں میں جا بجا ملتا ہے۔ غیر مردف زمین ''اگر کٹ گئی آج زنداں کی رات۔'' میں ایک پوری غزل کا مرکز انسان، انسانی جدوجہد اور نظریاتی انقلابیت کی عظمت کا بیانیہ ہے۔

چلو تو سدا سر اُٹھا کر چلو   تمہیں راستا لے گی ہر کائنات
ظفر جانبِ دار جاتا ہوں میں   اگر چل سکو تو چلو میرے ساتھ

اپنے سماج سے خصوصاً عام اکثریت کے حوالے سے ان کا رشتہ اپنی جگہ قائم ہے۔

فروزاں کر رکھی ہیں دہر نے اغراض کی شمعیں
ہمارا نور تو ہے سرحد سود و زیاں کے پار
بہت ظلم دنیا میں ہونے لگا ہے
حقیقت نہ دیکھوں تو افسانہ دیکھوں؟

محبت نہیں چاہتے جو ممالک
میں ان کے علاقوں میں ویرانہ دیکھوں

میں دیکھتا ہوں بکھرتے ہوئے تمہارے لوگ
نہ اتحاد ہے کوئی نہ اب کوئی تنظیم

سوکھی ہوئی پتیاں تو دیکھو
یہ عہد زوال کا چمن ہے

جائے گا نہ رائگاں میرا خوں
مت بھولنا یہ ستم سے پہلے

''پرندوں کی طرح شامیں'' کی منزل تک آتے آتے صابر ظفر کا ایک ایسے دوراہے پر پڑاؤ ہوا ہے جہاں سے ایک راستہ یقین کی طرف اور دوسرا راستہ گمان کی طرف بڑھتا ہے۔ راستے پر آگے بڑھنے میں وہ بے یقینی کی حالت سے دوچار ہیں۔

اک دوراہے پر ظفر یہ طے کر نہیں پا رہا کہ میں یقیں تک ساتھ جاؤں یا گماں تک ساتھ جاؤ۔

شاعر نے محسوسات کی یہ منزل جو بہر حال آخری نہیں ہے شاعری کے ایک طویل سفر سے گزرنے کے بعد پائی ہے۔ اس سفر کے دوران مقامی اور بین الاقوامی منظر نامے میں ایک بار نہیں بلکہ کئی بار بھونچال پیدا کرنے والی تبدیلیاں رونما ہوئیں اور انسانیت کے خوشگوار خواب کی تسبیح کے دانے ٹوٹ کر بکھر گئے۔

کب تک یہ سفر نہ ختم ہو گا
کب تک یونہی خاک دھول پھانکیں
بکھرے جب سارے رنگ تو پھر
سبز اور سرخ اور زرد کیا ہے

نیم کلاسیکی، جدید اور عام بول چال کی زبان، اس زبان کی علامتوں و محاوروں کے امتزاج سے جن میں مقامی زبان کے الفاظ و محاورے اور علامتیں بھی شامل ہیں سجی ہوئی شعری فضا کی بھی یہ مجموعہ بڑی حد تک تکمیل کرتا ہے۔ اصل میں یہی مستند معیاری زبان بھی ہے جو اٹھارویں صدی میں اردوئے معلّٰی کی مداخلت سے پہلے برصغیر کی لنگوا فرانکا زبان ہوا کرتی تھی۔ اس میں پھلنے پھولنے اور یونیورسل زبان ہونے کی صلاحیت بھی ہے۔ اس قسم کی شعری و ادبی زبان کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

سب خاک میں سو چکے جنونی
اب کون رما رہا ہے دُھونی

سب کاتنے والیاں سدھاریں
چرخہ ہی رہا نہ کوئی پُونی
ہمارا عہد ہے تم ختم اگر کرو دُوری
تمہارے نام کریں ہم یہ شام سیندوری
ہر سو یہ کھمبیاں ہیں جیسے
ایسے میں جا بجا رہوں گا
بیساکھی بن کر پریم تٹ پر
کب تک میں رینگتا رہوں گا
سمجھوں میں ظفر سپھل ہوا پریم
ہو جائے جو وہ کٹھور اچھا

ہے ضمیر میں یہ تیرا ہی گیت بھرا ہوا
میں بجا رہا ہوں اگر گھڑا، میرے کوزہ گر
یہ کنوئیں کی مٹی کنوئیں کو لگتی ہے جس طرح
رہوں تیرے من کی منڈیر پر، میرے کوزہ گر
کہاروں کو تو روزینہ ملا ڈولی اُٹھانے کا
گواہوں نے مگر دیکھے نہیں کے دُکھ بھی ہاں کے پار

صابر ظفر جدید اردو شاعری کی بھیڑ میں پائے جانے والے اُن گنے چُنے شاعروں میں ہیں جن کی شعری زبان کا تجزیہ، مطالعہ ایک اہم موضوع ہے جس پر ایک مفصل اور مکمل مضمون قلم بند کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ آپ اگر اپنی اصل تہذیب و تاریخ کے حقائق سے باخبر ہونا چاہتے ہیں، جو موجود تو ہیں مگر ان کو پردوں میں چھپا دیا گیا ہے تو اسی قسم کے مضمونوں سے ہوں گے۔ بصورتِ دیگر آپ اس حوالے سے شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کر سکیں گے۔

ان کے شعری سفر کی ابتدا ساٹھ کی دہائی کے دوران ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک ان کے اٹھارہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے اگر زمانی تسلسل کے ساتھ دیکھیں تو ان میں احساس کی نقش نگاری، اُسلوب کے نئے پن، لفظیات کے برتاؤ اور فنی تجربوں کے ارتقا کا ایک دھارا دکھائی دیتا ہے۔ ارتقا زمان و مکاں کی حدود میں خوب سے خوب کی طرف بہاؤ کا عمل ہے جس میں انحطاط کی گنجائش نہیں ہے۔ عموماً اچھے شعرا لفظی و فنی تجربوں سے گزرتے ہوئے ابتدائی مرحلے میں قلابازی کھا جاتے ہیں اور بعد میں سنبھالا لیتے ہیں۔ اصل میں خود کو نیا بنانے کے جوش میں وہ موزوں انتخاب کی شرط کو نظر انداز

کردیتے ہیں۔ نیا بننے کا احساس بجائے خود ایک مثبت رویہ ہے بشرط کہ وہ اپنی زمین کی تاریخ وتہذیب اور روایت کے تناظر سے تجاوز نہ کرتا ہو۔ صابر ظفر کی شاعری ''ابتدا'' سے لے کر ''پرندوں کی طرح شامیں'' تک مسلسل فنی و لفظی اور اُسلوبیاتی تجربوں سے گزری ہے مگر کسی بھی مرحلے پر اس نے پڑھنے یا سننے والوں کو بلاوجہ چونکایا نہیں ہے اور نہ شعری متون میں کسی طرح کی ناہمواری یا پیوندکاری کا نقص ہے۔ صاحبان دانش کا یہ مفروضہ کہ استعمال میں لائے جانے کے بعد وقت بیتنے کے ساتھ نئے الفاظ اور نئی اصطلاحات کو لوگ قبول کرلیتے ہیں۔ کوئی حتمی پیمانہ نہیں ہے۔ زبان کے ساتھ عام اکثریت کا رشتہ کسی منطق کو قبول نہیں کرتا ہے چنانچہ بہت سے نئے لفظوں، نئی ترکیبوں اور اصطلاحات جن کو اساتذہ، دانشور اور صاحبان اقتدار رائج کرنے کی ٹھان لیتے ہیں۔ عام اکثریت ان کو مسترد کردیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن شاعروں نے اردو کی شعری زبان میں انگریزی لفظوں اور ترکیبوں کے پیوند ٹانک کر ''میک اٹ اے نیو'' کے فرمان کی تکمیل کی ہے وہ ڈھیر ہوگئے ہیں۔ سوائے اکبرالٰہ آبادی جو تجربے کے اس پل صراط سے کامیاب گزرے مگر کیوں؟ اس لیے کہ انہوں نے انگریزی لفظوں کو سید احمد خاں، حاؔلی اور شبؔلی کے برعکس طنزیہ تنقیدی تناظر میں استعمال کیا۔ زیرِ گفتگو شعری مجموعے میں صابر ظفؔر نے صرف اپنی ایک غزل میں اس تجربے سے معاملہ کیا ہے۔

سب چانس اویل کر چکے ہیں
جو مجھ کو ملے وہ چانس کھٹکے

یہ غالبًا اس پڑھے لکھے کیریر ساز متوسط طبقے کے جوانوں کی نمونہ ہے جو وہ بولتے ہیں۔ یہ محاورہ سازی اور ہیں۔ ہمارے حکمران لیڈروں، حکام بالا، فلموں کے مقامی کرداروں، دیسی انگریزی دانوں اور ٹیلی وژن پر گفتگو کرنے والوں کی اختراع ہے اور اب نئی مراعات یافتہ مغرب نواز متوسط طبقے کی نسل کے توسط سے خالی ہوگئی ہے۔ اردو عبارت کو رومن رسم الخط میں لکھنے کی بھی ہمت افزائی کی جارہی ہے چنانچہ اخبار جنگ گروپ کے پکار نے زلولہ زدگان کی مدد کے لیے جو تصویری کارڈ جاری کیا ہے اس پر ''آیئے اس عید پر ہم ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں'' اس طرح چھپا ہوا ہے۔

"Aaiyee iss Eid par hum aik dosarary ka haath tham lain."

اب پڑھنے والے اس جملے کو یوں بھی پڑھیں گے ''آ ای یی اس عید پار ہم اَایک دوسارے یا دوسیرے کا ہا آتھ تھام لین۔'' انگریزی اخبارات اور رسائل بھی اردو اشعار اس طرح رومن رسم الخط میں شائع کرتے ہیں۔

صابر ظفر کی شاعری کا سفر ابھی جاری ہے جس کے اگلے مرحلے کے لیے ہمیں ''پرندوں کی طرح شامیں'' کے بعد آنے والے شعری مجموعے کا انتظار ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عارف ثاقب

ظفر اقبال کی شاعری کے تین رُخ

ظفر اقبال جیسی قد آور شخصیت پر گفتگو کرتے ہوئے مجھے اپنی کوتاہ قدی کا پورا احساس ہے۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ اُن کا شمار بہت سیدھے سادھے اور آسان شاعروں میں نہیں ہوتا، جن پر ہمارے بیشتر ناقدین بہت آسانی سے گفتگو کرجاتے ہیں اور جس کی وجہ سے طے شدہ موضوعات اور اسالیب پر روایتی گفتگو کے انبار لگے ہوئے ہیں۔

آپ سب جانتے ہیں کہ ۶۰ء کی دہائی میں اردو میں بڑے بڑے تجربے نظم کی صنف میں ہوئے۔ نئے نئے موضوعات، نئے اسالیب، نئی ہیئتیں پہلے نظم ہی میں وارد ہوئیں۔ پھر آہستہ آہستہ موضوعات اور اسالیب کی حد تک غزل میں در آئیں۔ وہ بھی محض اس حد تک جس حد تک غزل کی روایتی ہیئت نے قبول کیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی بنیادی طور پر اُن تجربوں کی دہائی تھی جو نظموں میں شروع ہوئے تھے۔ البتہ بعض پختہ کار شاعروں نے اُنہیں غزل میں بھی برتا۔ جن میں ایک بڑا نام ظفر اقبال کا ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کے حوالے سے میں صرف تین پہلوؤں پر مختصراً اپنے تاثرات عرض کروں گا۔ ظفر اقبال کی شاعری میں تین مختلف صورتیں دریافت کی جاسکتی ہیں۔ جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تضادات کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک بڑا شاعر زندگی کے مختلف تضادات کو باہم مربوط کرکے کسی بڑی حقیقت کو منکشف کرتا ہے۔ مگر جب کسی شاعر کے ہاں زندگی کا ہر تضاد ایک بڑی حقیقت کو منکشف کرنے کا باعث بن جائے تو یہ اُس کے کمالِ فن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فکری سطح پر تو شاید اِس کی مثالیں بہت مل جاتی ہیں، مگر فنی سطح پر معدودے چند شاعر ہی ایسے ہیں جو لفظ کے بطن سے جہانِ معنی دریافت کرتے ہیں۔ ظفر اقبال کا شمار اُن چند شعراء میں ہوتا ہے جو لفظ کو اہمیت دیتے ہیں۔ چاہے وہ لفظ بے معنی ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ یہ جانتے اور مانتے ہیں کہ کوئی لفظ بھی بے معنی نہیں ہوتا۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ شاعری کی کوئی مخصوص لفظیات نہیں ہوتیں۔ ہر لفظ شاعری کا لفظ ہے۔ بس اُسے استعمال کرنے کا ہنر آنا چاہیے۔ تو اگر میں یوں کہوں کہ وہ لفظوں کو توڑتے ہیں پھر بناتے ہیں اور پھر توڑتے ہیں تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اسے آپ زبان کی شکست و ریخت کے عمل سے تعبیر نہ کریں۔ اگر لفظ گنجینۂ معنی کا طلسم ہیں تو پھر اِس طلسم کو توڑنا تو پڑے گا! اردو شاعری کے وہ ناقدین جو کسی شاعر کے ہاں فکری کلیت کی تلاش میں رہتے ہیں اُنہیں شاید ظفر اقبال جیسے شاعر سے مایوسی ہو۔ یہ اس لیے کہ ظفر اقبال کی شاعری میں کئی جزو ہیں اور وہ کہیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ملتے بلکہ ہر جزو اپنی ایک الگ شناخت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے اور اپنی اہمیت تسلیم کرواتا ہے۔ مجھے ظفر اقبال کی شاعری میں تین مختلف دھارے دکھائی دیتے

ہیں جنہیں میں مختصراً عرض کرتا ہوں، ان کا تفصیلی بیان مجھ پر قرض رہے گا۔

ظفر اقبال کی شاعری کا پہلا رُخ اینٹی غزل کی صورت میں میرے سامنے آتا ہے۔ کلاسیکی غزل کے ردِعمل کے طور پر غزل میں مضحک تجربات یا تجربات کا مضحک بیان جو اینٹی غزل یا بعض احباب کی نظر میں تغزل دشمن غزل کہی جاسکتی ہے۔ ظفر اقبال کی گلافتاب کی شاعری کو بالخصوص اس رجحان کی حامل شاعری کہا گیا اور اسی شعری مزاج نے ظفر اقبال کو ایک متنازعہ شاعر بھی قرار دیا اور یہی اُن کی شاعری کی شہرت کا باعث بھی بنا۔ ظفر اقبال کے لیے شاید دوسری حیثیت اتنی اہمیت کی حامل نہیں تھی البتہ ایک متنازعہ شاعر قرار دیا جانا اُن کے نزدیک تخلیقی زندگی کی علامت ہے۔ انہوں نے یگانہ کی طرح اپنے آپ کو منوانے کے جتن نہیں کیے، بلکہ اُن کے نزدیک اُن کی شاعری کے اس مزاج کا موضوعِ گفتگو رہنا بجائے خود اُس کی اہمیت کی دلیل ہے اور ہم سب نے دیکھا کہ اُن کے کٹیلے، کھردرے، مضحک اور طنزیہ پیرائے کے پیچھے ایک ایسی سنجیدگی چھپی ہوئی ہے جو اُنہیں اینٹی غزل کے بعض مخصوص رویوں سے الگ کر دیتی ہے۔

اینٹی غزل جس کی باقاعدہ روایت کا آغاز لکھنؤ سے ہوتا ہے جہاں غزل کی مریضانہ سنجیدگی کے خلاف آواز اُٹھائی گئی۔ یہ الگ بات کہ انشاؔ وغیرہ نے یہ رجحان غیر شعوری طور پر قبول کیا۔ سوداؔ کے ہاں بھی اِس انداز کے کچھ نقوش دکھائی دیتے ہیں، لیکن ہر دو شعراء کے ہاں مضحک صورتِ حال میں ایک طرح کا سوقیانہ پن در آتا ہے اور طنز میں بغض اور کینے کے عناصر شامل ہو جاتے ہیں۔ البتہ یگانہ کے ہاں پہنچتے پہنچتے مضحک اور ارفع میں حدِّ فاصل ختم ہو جاتی ہے اور بظاہر خندہ آور نظر آنے والے اِس انداز کے بطن میں شدید المیاتی صورتِ حال کارفرما دکھائی دیتی ہے۔ تاہم یہی اینٹی غزل اگر مضحک لہجے میں ارفع موضوعات کو پیش کرنے کا سبب بنتی ہے تو پھر ہم اِسے تغزل دشمن کس طرح کہہ سکتے ہیں۔ کیا غزل اتنی محدود صنفِ سخن ہے کہ اُس سے صرف تغزل کا تقاضا کیا جائے؟ اور اگر تغزل نہ ہو تو کیا مضحک تجربات کا غزل سے بیان قابلِ گردن زدنی ہے؟ شاید سلیم احمد اور شاد عارفی کے بعد ظفر اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ اہم سوال کھڑے کر دیئے ہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُن کی اِس مزاج کی حامل شاعری، موجودہ تہذیبی بحران پر تخلیقی طنز سے ہٹ کر ایک جارحانہ اُداسی اور بنجر پن کو فکر انگیز پیرائے میں بیان کرنے کا سبب بنی ہے۔ ہمارے تہذیبی روّیے، معاشرتی شکست و ریخت، غیر تخلیقی عناصر، بنجر پن کی فضا اور اقدار کا زوال کیا یہ سب کچھ تخلیقی ذہنوں کے لیے متنازعہ نہیں رہا؟ اور اگر یہ سب متنازعہ رہا تو پھر ظفر اقبال بھی متنازعہ رہے، کیونکہ انہوں نے ایسی ہی مضحک صورتِ حال کو مضحک پیرائے میں بیان کر کے اُس سے ارفع صورتِ حال کشید کی ہے۔ اپنے عصری رجحانات کی قبیح صورتوں پر طنز کیا ہے۔ ہر چند کہ بعض اوقات اُن کا یہ انداز حد سے متجاوز کرتا دکھائی دیتا ہے، مگر ایک شاعر جب معاشرے کی فکری کج روّیوں کو نشانہ بناتا ہے تو اُس کے ہاں ایک طرح کی جھنجھلاہٹ اور خفگی کی پرچھائیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

لہٰذا میری رائے میں مضحک اور ارفع کا متزاج ظفر اقبال کے تخلیقی سفر کا ایک اہم باب ہے۔

اسے محض اینٹی غزل کے مخصوص روّیوں کے تناظر میں دیکھنا نامناسب ہے۔ ظفر اقبال نے سنجیدہ اور غیر سنجیدہ، اعلیٰ اور پیش پا اُفتادہ کو باہم مربوط کر کے ایک طرح کی طنزیہ بصیرت افروزی پیدا کی ہے اور ظفر اقبال کے اس تجربے کے پیچھے یہی حقیقت کارفرما ہے۔

ظفر اقبال کی شاعری کا دوسرا رُخ شعری زبان سے متعلق ہے۔ دلچسپ بات یہ کہ اُن کی شاعری کا یہ پہلو بھی بہت سے لوگوں کی طبعِ نازک پر گراں گزرا۔ لیکن ظفر اقبال نے اپنے اِس تجربے کو بھی اپنی تخلیقی زندگی کا اہم تجربہ بنا دیا ہے۔ اُن کے ہاں شاعری کے لسانی اُسلوب میں زبان و بیان کے بندھے ٹکے اُصولوں اور قاعدوں سے انحراف کی مثالیں ملتی ہیں اور زبان کے عمل کو وسیع کر کے اُسے عصری زندگی پر اِس طرح محیط کرنے کی کوشش نظر آتی ہے کہ وہ ہر طرح کے تجربات اور کیفیات کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ شعر کی تفہیم کے لیے مروّجہ لغت کا سہارا لینے والوں کے لیے ظفر اقبال نے نئے لسانی پیرائیوں کی تشکیل کر کے مشکل پیدا کر دی ہے۔ اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے نئے اور تازہ ذہن سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ظفر اقبال کا لسانی تجربہ بنے بنائے شعری سانچوں کے خلاف ایک تازیانے کا حکم رکھتا ہے۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم اُسے ردّ کر دیں یا غزل کو مروّجہ سانچوں سے آزاد کر دیں۔ شاعری میں زبان کے مخصوص طریقِ استعمال کو افتخار جالب نے لسانی تشکیلات کا نام دیا تھا اور اُس کی بنیاد مروّجہ تلازمات سے گریز، لفظ کی شیئت اور لسانی ضابطوں کی شکست و ریخت پر رکھی تھی۔ ظفر اقبال کی شاعری کو بھی لسانی تشکیلات کے مخصوص نظامِ فکر میں رکھ کر پرکھا جاتا ہے۔ تاہم مجھے اُن کی اِس نوعیت کی شاعری میں زبان کی تشکیل کم اور زبان کا تخلیقی تجربہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ لفظ کو قائم بالذات سمجھتے ہوئے وہ ایسی لفظیات کو شعری تجربہ بنا دیتے ہیں جو شاعری کا لفظ تصور نہیں کیا جاتا۔ ظفر اقبال کے نزدیک ہر لفظ اہم ہے۔ ایک ہنرمند شاعر عام لفظ کو شعری تجربہ بنا کر خاص کر دیتا ہے۔ ظفر اقبال نے یہی کیا۔ لہٰذا اُن کے اِس تجربے کو مخصوص نظریات سے الگ کر کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ زبان کی شکست و ریخت کا عمل تہذیبی زوال کی علامت بھی تو ہوتا ہے جس میں روایتی فکر اور روایتی اسالیب بیان سے گریز اور بغاوت کا عمل راہ پاتا ہے۔ اسے محض شاعر کی بنیادی جانبداری سے جوڑنا غلط ہوگا۔ یہ بھی انسانی آدرشوں سے اپنا تعلق قائم کرتی ہے جس کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا تماشا ہم نے دیکھا ہے!!

نئی لفظیات کے استعمال کے تجربے سے ابلاغ کے کچھ مسائل ضرور پیدا ہوتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ابلاغ کا تعلق معنی سے ہوتا ہے مگر شعر میں محض معنی نہیں ہوتے، ایک پورا تجربہ بھی کارفرما ہوتا ہے جو مختلف سطحوں پر معنی دینے کے باوجود ختم نہیں ہوتا بلکہ ہر نئی کیفیت کے ساتھ نئے معنی پاتا ہے۔ اسی لیے شعر میں موجود بہت سی کیفیات نہ معلوم رہ جاتی ہیں۔ شاعر محض ابلاغ نہیں چاہتا، وہ اظہار بھی چاہتا ہے۔ جو لوگ لفظ کو قائم بالذات سمجھتے ہیں وہ ابلاغ سے زیادہ اظہار کے قائل ہوتے ہیں اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ظفر اقبال الفاظ کو قائم بالذات سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ اظہار کے زیادہ قائل ہیں۔ یہ

اظہار شاعری کے مروّجہ سانچوں کو توڑ کر نئے اور انوکھے تجربات کی صورت راہ پاتا ہے تو اِس میں شاعر کا کیا قصور؟ تو میرے نزدیک ظفر اقبال کی شاعری بعض مواقع پر ابلاغ کے بجائے اظہار کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ میں اُن کے ایسے تمام لسانی تجربات کو اُن کے تخلیقی اظہار کی مختلف صورتیں تصور کرتا ہوں جو صورتیں قاری کو سمجھ آ جائیں وہ ابلاغ اور جو نہ آئیں وہ شاعر کا اظہار!! آخر ہم شعر کی تمام تر کیفیات کو گرفت میں لینے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ خود ظفر اقبال کو دعویٰ نہیں۔ نہ ہی وہ خود کو زوروں سے منوانا چاہتے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ فیصلہ لمحۂ موجود میں نہیں بلکہ مستقبل کے کسی لمحے میں چھپا ہوتا ہے۔

ظفر یہ وقت ہی بتلائے گا کہ آخر ہم
بگاڑتے ہیں زباں یا زباں بناتے ہیں

جو معاشرہ دادِ ہنر دینے سے قاصر ہے ظفر اقبال اُس سے اپنے لیے شرمساری کا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ تقاضا خود معاشرے کے لیے شرمساری کا مقام ہے۔ زبان کو وسعت دینا، یا زبان کے بنے بنائے سانچوں سے الگ نئے سانچے ترتیب دینا زبان کو بگاڑنا کہاں ہے؟ اظہار کی ہر صورت زبان کے دائرے میں آتی ہے۔ میں اس ساری صورتِ حال کو ظفر اقبال کے اس شعر کے تناظر میں رکھ کر دیکھتا ہوں:

سمجھتا سوچتا خود بھی ہوں ، یہ بھی یاد رہے
دماغ رکھتا ہوں میں ، سر دیا گیا ہے مجھے

ظفر اقبال کا یہ شعر اُن روایت پرستوں کے لیے ایک چیلنج ہے جو اپنا دماغ گروی رکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں نئی سوچ اور نیا تجربہ کہاں سے آئے گا۔ انہی روایت پرستوں کے بیچ میں ظفر اقبال کی قامت کا بھرم قائم ہے۔ آج کے دور کے وہ بڑے شاعر جو مخصوص حلقوں میں نامور بھی ہیں۔ اسی لیے نامور ہیں کہ وہ مخصوص موضوعات اور جذبات واحساسات کی سطح سے آگے نہیں دیکھتے اور تجربہ کرنے سے ڈرتے ہیں۔ ظفر اقبال کی شاعری سطحی موضوعات اور روزمرہ سے ہٹ کر ہے اور چونکہ وہ تجربہ کرنے سے نہیں ڈرتے اسی لیے وہ مخصوص حلقوں میں نامور شعراء کے لیے متنازعہ ہیں۔ چنانچہ ناموری کا تاج اُن کے سروں پر سجا اور ظفر اقبال کے حصے میں اُن کا اپنا تخلیقی تجربہ آیا۔ جو انہیں بھی بہت عزیز ہے اور ہمیں بھی!

اور اب آخر میں اُن کی شاعری کے تیسرے پہلو کے حوالے سے ایک مختصر بات یہ ہے کہ ظفر اقبال کی اُفتادِ طبع نے غزل کے مخصوص مزاج کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اینٹی غزل اور زبان کے تخلیقی تجربوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے بہت سے ایسے زندہ اشعار بھی کہے ہیں جو زبان زدِ عام ہیں۔ اپنی شاعری کی ایک مختلف دنیا سے دوسری مختلف دنیا میں وہ غیر محسوس طریقے سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد کیفیات سے برسرِ پیکار رہنے والے ظفر اقبال ہر غزل میں ایک نئے تخلیقی تجربے کی صورت میں سرخرو ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کی ''اب تک'' کی غزلیں نت نئے مناظر کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اتنی متنوع جہات رکھنے والا شاعر شاید دوسرا کوئی نہیں۔ وہ ہر غزل میں کوئی نیا نقشہ بناتے

ہوئے گزر جاتے ہیں۔ کوئی ایک تصویر بناتے ہوئے کوئی دوسرا منظر دکھاتے ہیں۔ اسی لیے وہ ایک الزام کی دھن میں کوئی دوسری تہمت اُٹھانے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ یہ سب تضادات ظفر اقبال کی تخلیقی سرشاری کا نتیجہ ہیں۔ خالصتاً غزل کی شاعری ظفر اقبال کے ہاں متضاد خیالات کی وحدت اور بنیادی جذبات واحساسات سے ترتیب پاتی ہے۔ کہیں تلخیٔ حیات کا ست کھنچتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں احساس کی شدت سے پگھلنے کا عمل۔ کہیں جذبات میں طلاطم ہے اور کہیں ٹھہراؤ۔ فکر کہیں متانت اور سنجیدگی سے ہمکنار ہوتی ہے اور کہیں کہیں سوز دروں جذب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کہیں زندگی کے غم آگیں پہلو کی طرف اشارہ ہے اور کہیں زندگی کی طرب انگیزیاں موجزن ہیں۔ یہ تمام پہلو ظفر اقبال کی شاعری کے اُس پہلو کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں جو زبان کے تجربے اور غزل کی روایت سے بغاوت سے بالکل الگ ہیں۔

مجھے ایک ظفر اقبال کے اندر تین مختلف خصوصیات کی حامل شخصیات چھپی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک ظفر اقبال ان تینوں تخلیقی شخصیات سے نبرد آزما ہے۔ اگر ہم اُن کے اِس حوصلے کی داد دیں گے تو یہ اِن تینوں تخلیقی شخصیات کے نتیجے میں تخلیق ہونے والی شاعری کو داد دینے کے مترادف ہوگا۔ آپ نے دیکھا کہ ظفر اقبال نے روایت سے پھر بغاوت کرتے ہوئے اپنے عہد کے دوسرے شاعروں کی طرح اس کتاب کا نام کلیات نہیں رکھا۔ ''اب تک'' رکھا ہے۔ جانے کیوں زندہ شاعروں نے اپنی کلیات چھپوا کر بظاہر اپنی موت کا اعلان کر دیا ہے۔ مگر ظفر اقبال ''اب تک'' کے بعد اب تک ہیں اور یہی اُن کی تخلیقی زندگی کا اعلان ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر روبینہ رفیق

پروین شاکر: کشفِ ذات سے ادراکِ حیات تک

طوفاں ہے تو کیا غم مجھے آواز تو دیجئے
کیا بھول گئے آپ میرے کچے گھڑے وہ

نسائیت کی جرأت مندانہ تہذیب سے وابستگی کے احساس تفاخر سے سرشار یہ پُر اعتماد لہجہ پروین شاکر کا ہے۔ بیسویں صدی کی شعری کائنات میں ایک دل نواز گونج بن کر پھیلتا یہ لہجہ ایک نئے شعری عہد کی آفرینش کا سندیسہ بن جاتا ہے جس میں نسائی جذبوں اور تجربوں کے اظہار کو معذرت خواہانہ لب ولہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس نئے عہد کے طلوع کی خبر فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید کی شاعری میں ضرور موجود ہے مگر پروین شاکر کی شاعری میں اس کے طلوع کی بشارت ہے اور 'خوشبو' (۱۹۷۷ء) 'صد برگ' (۱۹۸۰ء) 'خود کلامی' (۱۹۸۵ء) اور 'انکار' (۱۹۹۰ء) اس کی تکمیل کی گواہی۔

اپنے شعری سفر کے آغاز ہی میں نہایت اعتماد کے ساتھ ہوا کے ہاتھ میں خوشبو کا ہاتھ تھمانے والی یہ لڑکی اپنے لڑکی ہونے پر معذرت خواہ نہیں ہے کہ "چاند کی تمنا کرنے کی عمر" میں کشفِ ذات کے اسم کی عطا نے اسے حد درجہ اعتماد بخشا اور اسی اعتماد کے سہارے وہ ذات کے شہر ہزار در کے چوتھے کھونٹ کی سمت کھلنے والے دروازے میں بھی بے دھڑک داخل ہوئی اور اس راہ پر چلنے کا حوصلہ کیا جہاں پیچھے مڑ کر دیکھنے سے پتھر ہونے کا خدشہ بھی ہوتا ہے لیکن اسی گلی میں زندگی کو خوشبو کے ساتھ کھیلنے کا موقع بھی تو ملتا ہے۔

ہونٹ بے بات ہنسے/ زلف بے وجہ کھلی/ خواب دکھلا کے مجھے/ نیند کس سمت
چلی/ خوشبو لہرائی مرے کان میں سرگوشی کی/ اپنی شرمیلی ہنسی میں نے سُنی/ اور پھر
جان گئی/ میری آنکھوں میں ترے نام کا تارہ چمکا (کشف)

محبت وہ قدیم تر جذبہ ہے جس میں نئے پن کے اَن گنت زاویے پوشیدہ ہیں جن میں کئی ابھی منکشف ہونے ہیں اور کچھ یہ انکشاف کر چکے کہ محبت وہ موسم ہے جب دھنک گیت بن کر سماعتوں کو چھونے آتی ہے۔ جب ہنسی کی رم جھم بنفشی بوندوں کی صورت روح میں جلترنگ بجاتی ہے جیسے قوس قزح نے پازیب چھنکائی ہو۔ یہی محبت پروین کی شاعری کا مرکزی تخلیقی تجربہ ہے جو اس کے شہر ذات کے سب روزنوں سے پھوٹا ہے۔

"وجود کو جب محبت کا وجدان ملا تو شاعری نے جنم لیا۔" (۱)

وہ محبت جو شہر جان میں بہار کی پہلی بارش کی طرح روح پر برسی اور "زندگی سبز روشنی میں نہا گئی ۔۔۔اور وجود کے سرمدی دھندلکے میں آب وآتش کچھ یوں بہم ہوئے کہ ہوا نے مٹی کے آگے سر جھکا

دیا۔۔۔مگر جب زندگی کے میلے میں رقص کی گھڑی آئی تو سنڈریلا کی جوتیاں ہی غائب تھیں۔ نہ وہ خواب تھا نہ وہ باغ تھا نہ وہ شہزادہ۔ اچھے رنگوں کی سب پریاں اپنے طلسمی دیس کو اُڑ چکی تھیں اور لہولہان ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتی شہزادی جنگل میں اکیلی رہ گئی اور جنگل کی شام کبھی تنہا نہیں آتی بھیڑیئے اس کے خاص دوست ہوتے ہیں۔" (۲)

اور یہی وہ شامِ تنہائی ہے جب زینہ بہ زینہ اُترتی آگہی ایک آشوب کی صورت اس پر وارد ہوئی اور من وتُو کے مقدس سلسلے کی اوٹ میں چھپی بدصورت حقیقتوں کے ساتھ کئی اور حقیقتیں بھی منکشف ہوتی ہیں کہ مادرزاد منافقوں کی بستی میں وہ اکیلی نہیں اس کا پورا قبیلہ صدیوں سے رائج متعصّبانہ سماجی فکر کی تخلیق کردہ تازیانہ بردار قدروں اور نظروں کا ہدف ہے۔ یوں اس کے عہد کی خود آگاہ اور پُر اعتماد لڑکی یا عورت اس وسیع دنیا میں سب سے غیر محفوظ وجود بھی ہے۔ وہ لڑکی جو اعتراف کی توفیق کے ساتھ ہوا کے ساتھ سفر کا مقابلہ کرنے کا ارادہ باندھتی ہے تو منافق ہوا کے حواری اسے شکست دینے کے سارے حربے بھوکی آنکھوں کی گرسنہ چمک اور جلتے فقروں کی غراہٹ میں سمو لیتے ہیں۔ پروین کی شاعری میں عورت ہونے پر ندامت کا احساس تو نہیں مگر سب سے کمزور ہدف ہونے پر دُکھ کا احساس ضرور ہے۔ دُکھ کا یہ احساس عورت کی صدیوں کی تربیت یافتہ اس نفسیات کے جلو میں جاگتا ہے جو پناہ طلبی کی خواہش میں مرد کی طرف ہی دیکھنے کی بے ساختگی میں مبتلا ہے۔

بھیڑیئے مجھ کو کہاں پا سکتے وہ اگر میری حفاظت کرتا
ردا چھنی تھی مرے سر سے مگر میں کیا کہتی کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا

سوچ کے دیئے جلانے کی مجرم اس عورت کا المیہ یہ بھی ہے کہ جن رشتوں اور سلسلوں کے ساتھ وہ توقعات کی خوش گمانیاں وابستہ کرتی ہے پہلا سنگ ملامت اُدھر ہی سے آتا ہے۔ پھر اس کا المیہ یہ بھی تو ہے کہ "اس ہیر کا رانجھا اسے خود زہر پلاتا ہے اور اس سوہنی کا گھڑا خود مہینوال بدل دیتا ہے۔" (۳)

زندگی کوئے ملامت میں تو اب آئی ہے اور کچھ چاہنے والوں کے سبب آئی ہے

شہر کے سارے معتبر آخر اسی طرف ہوئے جانبِ لشکرِ عدو دوست بھی صف بہ صف ہوئے
جاں سے گزر گئے مگر بھید نہیں کھلا کہ ہم کس کی شکار گاہ تھے کس کے لیے ہدف ہوئے

یہ ملامتیں، یہ بے امانی کبھی اس کے لہجے میں تلخی بھر دیتی ہے۔ کبھی ملامتوں کی سنگ باری میں زندگی کرنے کا حوصلہ کرنے پر تفاخر کا احساس اور کبھی شکوے کا رنگ۔

پھر رہے ہیں میرے اطراف میں بے چہرہ وجود ان کا کیا نام ہے یہ لوگ ہیں کن ذاتوں کے
ہوا کے ہوتے ہوئے روشنی تو کر جائے مری طرح سے کوئی زندگی تو کر جائے
گونگے لبوں میں حرف تمنا کیا مجھے کس کور چشم شب میں ستارا کیا مجھے

زخمِ ہنر کو سمجھے ہوئے ہیں گلِ ہنر　　کس شہر ناسپاس میں پیدا کیا مجھے

اور پھر اس تلخ سچائی کا اظہار

کوئی سیفو ہو کہ میرا ہو کہ پروین اسے　　راس آتا ہی نہیں چاند نگر میں رہنا

کوئی ملامت کے بے اماں موسموں کی تعزیرانہ روش ہی روح میں چھید نہیں ڈالتی بلکہ ایک مکمل انسان ہونے کی خوش گمانی پر آدھی شہادت یا نصف گواہی کا کوڑا پڑتا ہے تو اس عورت کو اپنی ہی نگاہ میں کم قامت ہو جانے کے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے اور اس قانون کی آڑ میں معاشرے کا بداخلاق وحشی اپنی تسکین کے سارے سامان محفوظ کیے ہوئے ہے۔

میری پھٹی ہوئی ردا دے گئی بیاں مگر　　فیصلہ رک گیا ہے ایک اور گواہ کے لیے

شہادتیں میرے حق میں تمام جاتی تھیں　　مگر خموش تھے منصف نظیر ایسی تھی

یہی وہ مقام جہاں عزت نفس کی پامالی کے مسلسل منظر نے اس کو حرمت ذات و پندار کے ساتھ سر اُٹھا کر جینے کا فیصلہ کرنے میں مدد دی۔

شام ڈھل جانے کے بعد/ جب سایہ اور سایہ کناں دونوں بے معنی ہو جاتے
ہیں/ میں مکروہ ارادوں والی آنکھوں میں گھر جاتی ہوں/ اور اپنی چادر پر تازہ
دھبے بنتے دیکھتی ہوں/ کیونکہ مجھ کو ایک ہزار راتوں تک چلنے والی کہانی
کہنا/ نہیں آتی / میں ___ آقائے ولی نعمت کو/ خود اپنی مرضی بھی بتانا چاہتی ہوں
(تو برمن بلا شدی)

اور یہ وہ مقام بھی ہے جہاں مکروہ ارادوں والی آنکھوں سے بجھے شہر ناسپاس کے غیر ہمدرد رویے کے تناظر میں وہ حصارِ ذات کے شر سے نکلنے کی دعا کر کے عشقِ کائنات کے وسیع تر جہان میں قدم رکھتی ہے۔ اس کی حساسیت پھر صرف عورت کے استحصال اور کم مائیگی تک محدود نہیں رہتی بلکہ ایک وسیع تناظر کی حامل عصری حسیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنے عصری سیاق وسباق میں انسان ہونے اور زندگی کی میکانکیت میں فرد کی معنویت کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

پروین کی عصری حسیت بہت تیز ہے اس نے اپنے عہد کی پوری نسل کا ذہنی وجذباتی تجزیہ ہی نہیں کیا بلکہ ان ہواؤں اور حبس آلود فضاؤں کا جائزہ بھی لیا ہے جن میں سانس لینا آزاد اور اختیاری فعل سے زیادہ جبری فعل کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پروین کا اور ہمارا عہد غیر متعین منزلوں کی بے سمت تلاش میں اپنی توانائیاں صرف کرنے والا عہد ہے۔ ارادہ ہم مکے کا کرتے ہیں جا کوفے میں نکلتے ہیں۔

سفر کے باب میں کتنے عجیب لوگ ہیں ہم　　کہاں کا قصد کیا چل پڑے کہاں کے لیے

فسانہ اپنا کسی اور باب میں ہے رقم　　ہے انتخاب کسی اور داستاں کے لیے

اور

آگے تو صرف ریت کے دریا دکھائی دیں　　کن بستیوں کی سمت مسافر نکلے گئے

بے سمتی کا یہ رائیگاں سفر جذبوں، ارادوں اور حوصلوں پر پژمردگی طاری کر دیتا ہے اسی لیے خود غرضی، بے حسی اور لاتعلقی ہمارے عہد کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ پروین جیسی حساس ذہن و دل رکھنے والی شاعرہ اس المیے پر ششدر بھی ہے اور دکھی بھی۔ غیر منصفانہ اور ناہموار سماجی نظام میں پھیلی بھوک، محنت کی رائیگانی اور زندگی کرنے کی بے ثمر کوششیں ذہن، دل اور بصارت پر صرف جما دیتی ہیں۔ پروین کبھی تو اس صورتِ حال میں سلگ اُٹھتی ہے اور کبھی اس کے لہجے میں نمی در آتی ہے۔

سڑکوں پہ رواں یہ آدمی ہیں　　یا نیند میں چل رہی ہیں لاشیں

اور

یہی رہا ہے مقدر مرے کسانوں کا　　کہ چاند بوئیں اور ان کو گہن زمیں سے ملیں

وہ یہ بھی جانتی ہے کہ محنت کرنے والے سارے طبقوں کا مقدر ان کے خالق کی بجائے زمین پر بسنے والے کم قامت فرعونوں نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ رعونت کی کیچڑ میں لت پت یہ فرعون خدائی کے نشے میں بدمست، انسانوں کو حشرات الارض تصور کرتے ہوئے جبر کے تازہ فرمانوں پر دستخط کرتے رہتے ہیں اور تازہ ہوا میں سانس لینے کی سوچ اور آرزو پر زندگی کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔

سوچ کا رشتہ سانس سے ٹوٹا جاتا ہے　　لُو سے زیادہ جبر فضا کے حبس میں ہے

ایک طویل عرصے سے تاریخی، سیاسی اور سماجی جبر کے ہاتھوں محبوس یہ عہد ذہن و جسم کی لاتعلقی کے مظہر میکانکی انسانوں کی ایسی بستی ہے جس کی تعزیری فضا میں شجر ذہن پر بیٹھے سوچ کے پرندے تک صیاد کی نظر میں رہتے ہیں۔ خوابوں، امیدوں اور تازہ ہواؤں پر فرمان نظر بندی صادر ہو جاتا ہے۔ کوچہ منافقت میں جبر کے ہاتھوں پر بیعت کا انکار کر کے سچ اور سوچ کے سفر پر نکلنے والے مسافروں کے لیے زندگی دشت کرب و بلا بن جاتی ہے اور وقت شام غریباں اور خواب جلے ہوئے خیمے کی راکھ، بے ردائی سے کسی اور اندیشوں سے ٹھٹھرتی ہوئی فضا اور غنیم کا تنگ ہوتا حصار۔ ایسے میں غنیمت ہے کہ ردِّ بلا کا اسم یاد ہے

کوفۂ عشق میں/ میری بے چارگی/ اپنے بالوں سے چہرہ چھپائے ہوئے/ ہاتھ
باندھے ہوئے/ سر جھکائے ہوئے/ زیرِ لب ایک ہی اسم پڑھتی ہوئی/
یاغفورالرحیم/ یاغفورالرحیم (اِدرکنی)

مگر یہ دکھ تو اپنی جگہ ہے کہ کوچۂ مصلحت و عافیت میں پناہیں تراشنے، اپنے مفادات کے ہاتھوں پر بیعت کرنے والے ہم لوگ اپنی نامرادانا کے ہاتھوں اس قدر شکست خوردہ ہیں کہ ذرا سی پیاس کے عوض فرات وارنے کو تیار ہو جاتے ہیں اور مصلحت کا نام دے کر سرخرو ٹھہرتے ہیں مگر گردوپیش کی اس مصلحت کوش فضا میں بھی پروین ظلم سہنے، اس کو قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ صدائے احتجاج بلند کرتی ہے، فصیلیں توڑنے والے ہاتھوں کی حوصلہ افزائی اس کا ضمیر بھی ہے اور منشور بھی۔ اس کی سوچ کا سورج

بجھا نہیں اس کا سچ عافیت کوش نہیں ہوا۔

ظلم سہنا بھی تو ظالم کی حمایت ٹھہرا　　　خامشی بھی تو ہوئی پشت پناہی کی طرح
فصیلیں توڑ نہ دیتے جواب کے اہلِ قفس　　　تو اور طرح کا اعلانِ جبر آ جاتا

پروین نے ظلم اور جبر کے خلاف حق کی حمایت کا اعلان اپنی نظموں 'ادرکنی علیؑ مشکل کشا سے'، 'شامِ غریباں'، 'تقیہ' اور 'واوف بعہدک' میں بھی بڑی جرأت کے ساتھ کیا ہے اور یہ نظمیں گواہی دیتی ہیں کہ

> ''پروین اس حق سے منحرف شہر میں حق کی راہ پر قائم رہنے کے لیے زندہ ماضی سے روشنی اور استقامت کی طلب گار ہیں وہ اس شہرِ رسن بستہ کے طرز توکل پر حیران ہیں اور اس کی اصول فروشی، ظلم دوستی اور تقیہ پسندی کو طنز کا نشانہ بھی بناتی ہیں۔ 'ایران'، 'ظلّ الٰہی کے پرابلمز'، 'ایک معقول نکاح' اور 'کتوں کا سپاس نامہ' کی سی نظموں میں طنز کے نشتر ایک بیمار معاشرے کی چارہ گری کا اسم ہیں۔'' (۴)

اور چارہ گری کا یہ اسم تلاش کرنے کا فرض اس نے یوں بھی ادا کیا کہ اس کی بینائی آگہی کی بے کنار وسعتوں میں یہ ادراک کر لیتی ہے کہ جبر سہنے والی مخلوق پر زندگی کے کچھ دروازے تو دیدہ و نادیدہ ہاتھوں نے بند کیے اور کچھ کو خود ان کے اندر موجود کمزوریاں، ناہمواریاں، خود غرضیاں، مفاد پرستی اور منافقتیں بند کر رہی ہیں اس لیے اس کے لہجے میں ان بد اعمالیوں کے خلاف شبیہ کا عنصر اُبھر آتا ہے۔

ہم وہ شب زاد کہ سورج کی عنایات کے باوصف　　　اپنے بچوں کو فقط کور نگاہی دیں گے
شہر کی چابیاں اعدا کے حوالے کر کے　　　تحفتاً پھر انہیں مقتول سپاہی دیں گے

بدن تک موجِ آب آنے کو ہے پھر　　　یہ بستی زیرِ آب آنے کو ہے پھر
زمیں انکار کے نشے میں گم ہے　　　فلک سے اک عذاب آنے کو ہے پھر

پابہ ِگل سب ہیں رہائی کی کرے تدبیر کون　　　دست بستہ شہر میں کھولے مری زنجیر کون

اس دست بستہ شہر کی سیہ بختی کی ایک وجہ جہاں دشمن کی بجائے اپنے لشکر کے سبب محصور ہونا ہے وہیں اس کی کم نصیبی یہ بھی ہے کہ حاکم شہر کی کوتاہ اندیشی، ذات و ذہن کے تنگ حصار میں گردش کرتی خود پسندی اور آس پاس موجود خوشامدانہ آوازوں کی رال ٹپکاتی بھنبھناہٹ اس تک شہر رسن بستہ کی زنجیروں کی آواز پہنچنے ہی نہیں دیتی۔

حاکم شہر کے اطراف وہ پہرہ ہے اب　　　شہر کے دکھ اسے موصول نہیں ہو سکتے

سچے تخلیق کار کا ضمیر کبھی بھی جنبش ابروئے شاہاں کا منتظر نہیں ہوتا کہ اس کا وعدہ (Committment) اپنے قلم سے اپنے عہد اور ضمیر سے ہوتا ہے۔ پروین جہاں زندگی کے کوچۂ ملامت سے کوئے منافقت میں آ جانے اور بے حسی مفاد پرستی، عافیت کوشی کے کرب و بلا میں گھر جانے پر

ملول ہے وہیں سوچ اور قلم کی حرمت کا سودا کرنے والے تخلیق کاروں سے بھی نالاں ہے۔

ہمارے عہد میں شاعر کے نرخ کیوں نہ بڑھیں　　　امیرِ شہر کو لاحق ہوئی سخن فہمی
اس شہرِ سخن فروشگاں میں　　　ہم جیسے تو بے ہنر ہی ٹھہرے

مگر یہ بھی طے ہے کہ پروین امڈتے اندھیروں کی اس بستی کے آئندہ سے مایوس نہیں۔ ہتھیلی پر چراغ جلائے ہوئے اس کی آنکھ میں آنے والی صبح کے روشن یقین کی کرن ہے اور یہ کرن تاریکی کی طویل سرنگ میں جگنو بن کر مسکراتی ہے۔

ہوا کا زور کسی شب تو جا کے ٹوٹے گا　　　بچا کے رکھنا ہے کوئی دیا مکاں کے لیے
ڈھونڈے گا پھر اُفق کھوئی ہوئی پرواز کا　　　دیکھنے میں آج یہ طائر شکستہ پرتو ہے
رات ہر چند کہ سازش کی طرح گہری ہے　　　صبح ہونے کا مگر دل میں یقیں رکھنا ہے

اور یہی یقین ہی تو بانجھ موسموں میں دل کی دھرتی کو شاداب رکھتا ہے۔ حوصلوں اور امنگوں کو بھی خوابوں اور امیدوں کو بھی۔

زمینِ دل یونہی شاداب تو نہیں اے دوست　　　قریب میں کوئی دریا ضرور بہتا ہے

اور یہ محبت کا دریا ہے کہ ''بارشیں اگر روٹھ بھی جائیں تو اس کے پانی کم نہیں ہوتے۔''

حوالہ جات

۱۔ پروین شاکر: ''دریچۂ گل سے'' دیباچہ خوشبو، مشمولہ ماہ تمام، مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸۔
۲۔ پروین شاکر: ''رزق ہوا......'' دیباچہ صد برگ، ایضاً
۳۔ فتح محمد ملک: ''تحسین و تردید''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۱۶۲۔
۴۔ ایضاً　　ص ۱۶۷۔

☆☆☆

گیری پوٹرا اور جوز لوپز/نسیم عباس دوسرا حصہ

مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید کے مقام کا تعین

بیسویں صدی میں دو ذہنی ردِعمل ''مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید'' سامنے آئے جس طرح دو واضح فلسفیانہ ارتقاء: نیچرل سائنس کی اثباتی تفہیم، اور سوشل مظاہر کی تفہیم کی کوشش میں لسانی تشکیل۔'' ان دو ارتقاء کی شاخ در شاخ تاریخی تقسیم، ایک دوسرے سے مربوط ہے اور مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید کے عصری وجود کے بنیادی اختلافات سے بھی واضح ہوتی ہے۔

کارل پوپر، منطقی اثباتیت کے ویناسکول (Viena School) کے ایک مشہور نقاد تھے۔ ان کی اور کارل ہیمپل کی سائنسی وضاحت کے لیے پیش کردہ مفروضیاتی قیاس، بیسویں صدی میں، متذکرہ دونوں سائنس کے فلاسفروں اور دوسرے سائنس دانوں میں سائنس کی مدلّل غالب تفہیم بن گئی۔ ان کی سائنسی وضاحت نے پیشین گوئی اور غلط بیانی کے خطرے پر زور دیتے ہوئے، مختلف اثبات پسندوں، صداقت اور موافقت کی دوسری تفاصیل کی جگہ لے لی۔ تاہم، اثباتیت کو تنگ نظر تصور کیا گیا۔ کھلے ذہن سے دیکھا جائے تو ان کی سائنسی وضاحت کو بھی اثباتی قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ (سائنسی وضاحت)، اثباتیت، حتیٰ کہ ایک بنیادی فلسفیانہ بنیاد 'تجرباتی سائنس' میں شامل ہو جاتی ہے۔ یہ توضیح، پیشین گوئی اور تمام عملی مقاصد کے توازن پر زور دیتے ہوئے، اثباتیت کا حصہ بن جاتی ہے۔ مابعد جدیدیت اور حقیقت پسندوں کے حوالے سے پوپر اور ہیمپل کی سائنسی وضاحت کو اثباتی قرار دیا جاسکتا ہے۔ تاہم وہ (مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند) ایسا مختلف وجوہات کی بناء پر کرتے ہیں۔ مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید کے ظہور سے قبل ہی، سائنس کی اثباتی وضاحت، مسائل زدہ ہوگئی تھی۔ سخت انداز برتتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کی اثباتی وضاحت، علم کے حصول کیلئے ترقی پسندانہ روش پر زور دیتی ہے یہ سائنس کو بطور، دریافت کا مجموعی جاری عمل اور سائنسی جدوجہد کی غیر دلچسپ معروضیت پر زور دینے کا، ایک رجحان بن چکا ہے۔ گذشتہ چند جملے، بلاشبہ غیر ضروری سادگی کا مظہر ہیں جو کہ سائنس کی نوعیت کا بالکل غیر مدلل تجزیہ تھا۔ اِن میں کچھ درجوں کی سچائی بھی ہے اور سچائی کی اہم ترین عمق بھی لیکن غیر ضروری سادگی، بہت حد تک غلط بیانی بھی ہوسکتی ہے۔

یہ کہنا غیر ضروری سادگی سے کم نہیں ہے کہ مابعد جدیدیت کی اثباتیت کی تردید، سائنس کے بطور دریافت کے عمل کے سادہ تصور کے مکمل وثوق پر مبنی ہے۔ مابعد جدیدیت، سائنس اور علم کی پیداوار کے سماجی تعمیری عمل کو سمجھتی ہے۔ سائنسی علم کی سماجی تعمیری نوعیت کو بیسویں صدی کی ایک بہت اہم تصنیف ''سائنسی انقلابات کی ساخت از تھامس کوہن'' میں ڈرامائی انداز میں بیان کیا گیا تھا۔ اس تصنیف میں

نیچرل سائنس کی حقیقی تاریخ کی تحقیق کی گئی ہے اور سائنسی تصور کے سماجی و تاریخی عوامل کو پرجوش انداز میں واضح کیا گیا ہے۔ سائنسی تجربات اور مخصوص سائنسی نظریات کی قبولیت عمرانیاتی نتائج کی ذیل میں آتے ہیں۔ یہ غیر مرئی خالص پن کہ سائنس، اثباتی تناظر کا سامنا کیسے کرتی ہے، واضح طور پر غلط ثابت ہوا تھا۔

بلاشبہ کوہن کے کام سے مابعد جدیدیت اور حقیقت پسند تنقید دونوں میں پیش رفت ہوئی اور ہم ایک لمحے میں جان جائیں گے کہ وہ اپنے عصری وجود کے بنیادی فلسفیانہ اختلافات کا اظہار کرتی ہیں۔ کوہن نے سائنسی علوم کے ارتقاء میں انسانی دلچسپی کے تاریخی اظہار کو بھی واضح کیا۔ تحقیق کی سمت، اور مدلل علوم کی قبولیت یا تردید، بنیادی انسانی عوامل میں سے تھے۔ ترقی دادہ مستبقل کے اعداد شمار، حد اور سرمایہ کاری کے معاشی عوامل میں اضافہ، سے یہ اثرات مرتب ہوئے کہ کونسی چیز، سائنسی طور پر یقین کی صورت اختیار کرتی ہے۔

نظریات تعمیری ہوتے ہیں، اسی لئے علم سے لازم وملزوم چیز، کوہن کے کام کی ممکنہ توضیح ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ یقین کرنا ممکن ہو کہ علم انسانیت کی سماجی طور پر تصدیق کرے۔ یہ وہ مسئلہ ہے جسے کوہن کے کام نے بھی حل نہ کیا اور نہ ہی کر سکتا تھا۔ بنیادی لزومیت کی یہ قسم، مابعد جدیدیت کی بدترین قسم سے اخذ کی گئی ہے اور یہ اس سے بہترین انداز میں جدا بھی ہوئی ہے۔ اسے حقیقت پسندی نے مکمل طور پر رد کر دیا ہے۔ حقیقت پسند تنقید کے ساتھ ہی ایسے لزومیت اور سماجی تعمیر کے پہلو ہیں۔ ہم ایک لمحے میں اس طرف آئیں گے، لیکن یہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ ایک نظریے کی دوسرے نظریے پر برتری کیلئے اعلیٰ بنیادی وجوہات ہوسکتی ہیں اور وجوہات کے تعلق نے باوجود بھی ایک نظریہ، دوسرے نظریے کی نسبت حقیقت کی بہتر صورت پیش کرتا ہے۔

کوئی کہہ سکتا ہے کہ کوہن کے کام نے نئے عصری وجودوں کو مدعو کیا، جس کی آج سائنسی عمرانیات میں بھی تقلید کی جا رہی ہے۔ جو کہ مابعد جدیدیت کے ساتھ صف آراء ہے۔ تاہم یہ ابتدائی سماجی اور سائنسی نظریاتی اثرات، نئ تشکیلی روایت، کے ساتھ زیادہ مضبوط تعلق استوار کئے ہوئے ہے۔ مابعد جدیدیت کو بھی اسی روایت کا ہم عصر اظہار کہا جاسکتا ہے اور جو ہم نے اسے پہلے، سماجی نظریات میں بطور، لسانی تشکیل، کے پیش کیا اسی سے اخذ کردہ ہے۔

سوشل سائنس کے فلسفہ میں بہت سے تاریخی مبحث، نیچرل ازم کے مسئلہ کی طرف مراجعت کر گئے ہیں۔ یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایک سماجی مظہر کو نیچرل سائنسی علوم کے اشیاء کے مطالعے کی طرح کھلے انداز میں پڑھا جاسکتا ہے یا نہیں اور پڑھنا چاہیے یا نہیں۔ دوسرا یہ کہ سوشل سائنس کو سائنسی انداز بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس مبحث کا تاریخی پس منظر گمراہ کن ہے۔ ایک سطح پر اثباتیت کو نیچرل سائنس کے حوالے سے بطور ایک سائنسی طریقہ کار، سائنسی نظریئے اور سائنسی قانون کے مواضح بیانیہ کے قبول کیا گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ سوشل سائنس کے حوالے سے یہ قابل اطلاق تھی یا نہیں۔ اثباتی سوشل سائنس دانوں کے

نزدیک اس کا جواب اثبات میں تھا۔ سائنسی تجربہ، ان سوشل سائنسز میں بھی جہاں تجربہ ممکن نہیں تھا، یکساں تھا۔ تاہم سوشل سائنس میں نئ تشکیلی روایت، اس خیال کو ہمیشہ رد کرتی رہی ہے۔ یہ (نئ تشکیلی روایت) دو موضوعاتی موادوں یا علم کے ماخذات یا وہ انداز جس میں افراد، اجتماع کی طرح نہیں ہوتے، کے درمیان حقیقی اختلافات کو واضح کرتی ہے۔

سماجی عمل کے بارے میں سب سے اہم حقیقت مثال کے طور پر یہ ہے کہ یہ معنی خیز ہے۔ نیچرل سائنس جس کا نقطہ ارتکاز عارضی وضاحت ہے اور سوشل سائنس جس کا نقطہ ارتکاز مفاہمت ہے، ان دونوں کے درمیان ایک تصوراتی خلیج ہے۔ نئ تشکیلی روایت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ سماجی حقیقت کی مفاہمت، ایک زبان کی مفاہمت سے، مشین کی نسبت زیادہ بُعد کی حامل ہے۔ لسانی تشکیل کے دو رُخ ہیں: ایک یہ کہ انسانی معاشرہ، تفتیش کا آلہ ہے جو کہ زبان سے مماثل خدوخال رکھتا ہے اور دوسرا رخ یہ کہ نظریہ اور علم زبان کی تشکیل کا باعث ہیں۔ سماجی حقیقت کے ایسے خدوخال، اس کی سائنسی تفتیش کو ناممکن بناتے ہیں۔ مابعد جدیدیت تاریخی حوالے سے ایک طرف وٹگنسٹائن سے اخذ کردہ ہے اور دوسری طرف پسِ ساختیات سے، تاہم اسے نئ تشکیلی روایت کا عارضی تغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

امتیازی طور پر حقیقت پسند تنقید نے ابتداً نیچرل سائنس میں مضبوط اور حیران کن اثباتی تنقید سے ترقی حاصل کی۔ اگرچہ حقیقت پسند تنقید نے پوپر اور ہیمپل جیسے مفکرین کے کام کی اہمیت کو کم نہیں کیا۔ یہ نیچرل سائنس کی توضیح میں بنیادی نقائص کو بیان کرتی ہے۔ یہ نیچرل ازم کے مبحث کو سوشل سائنس میں مکمل طور پر بدلنے کا اثر رکھتی ہے، حقیقت پسند نقاد، نیچرلسٹ بھی ہوتے ہیں۔ سماجی مظاہر کا سائنسی انداز میں مطالعہ ممکن بھی ہے اور قابل خواہش بھی ___ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اثبات پسند یا نئ تشکیلی روایت (مابعد جدیدیت) میں سے ہر ایک کیا فرض کرتا ہے۔ یہ سوشل سائنس کے فلسفہ میں نئ تشکیلی روایت کے ساتھ بنیادی دلائل کی کمیابی کا پہلا نکتہ ہے۔

اختلاف کا دوسرا نکتہ، اگر ممکن ہو، تو بہت اہم ہے۔ حقیقت پسند تنقید سوشل اور نیچرل سائنس کے مخصوص مضامین کے درمیان اہم اختلافات کو قبول کرتی ہے۔ یہ سماجی سائنسی علوم کے مقاصد کے مخصوص انسانی خدوخال کی درست سطح پر تفہیم کرتی ہے۔ جو کہ نئ تشکیلی روایت کے مطابق ہے جو کہ سائنسی وضاحت کو متاثر نہیں ہونے دیتی، یہ قبول کرتی ہے کہ انسانی معاشرہ ایک میکانکی مشین کی بجائے ایک زبان کی طرح ہے۔ یہ سماجی پیش کش میں، رویوں کی تمام اہمیت کو قبول کرتی ہے۔ یہ نظریے کی نوعیت میں ''لسانی تشکیل'' کی اہمیت کو قبول کرتی ہے۔ یہ علوم کی سماجی تعمیری نوعیت کو قبول کرتی ہے۔ یہ انسانی علوم کی بھول بھلیوں اور اس کے سماجی عوامل کو قبول کرتی ہے۔ لیکن یہ دلیل دیتی ہے کہ یہ اہم اختلافات ہیں جو کہ نیچرل سائنس اور انسانی علوم کے مقاصد کے درمیان پائے جانے والے اختلافات ہیں۔ جو کہ یہ الزام دیتے ہیں کہ نیچرل سائنس اور انسانی علوم کو سائنسی مطالعہ ناممکن بناتا ہے۔ درحقیقت یہ دلیل اسے

بہت دور لے جاتی ہے کہ یہ دراصل انسانی ماحول کی وہ اہم خصوصیات ہیں جو نہ صِرف سائنسی مطالعہ کو بخوشی قبول کرتی ہیں بلکہ آخرکار سماجی زندگی کو ممکن بناتی ہیں۔

تاہم حقیقت پسند تنقید، تفہیمی تنبیہ کو خود شکستہ ارتباطیت کی مخالفت کیلئے، سائنسی علوم کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ انسان علم پیدا کرتا ہے، انسان غلطی پر بھی ہوسکتا ہے۔ سائنس، خالص علم نہیں ہے اور توضیحات اور طریقہ ہائے کار جن کیلئے اسے استعمال کیا جاتا ہے، اِن دونوں میں نظریاتی طور پر مسخ شدہ عناصر کے طور پر بھی مشتمل ہوسکتی ہے۔ علم کی پیدائش خواہ نیچرل سائنس میں ہو یا سوشل سائنس میں، اس کے سماجی عوامل ہوتے ہیں۔ علم کی پیدائش ایک سماجی عمل ہے اور اس میں زبان گہرا دباؤ رکھتی ہے۔ تاہم علم کو اس کے سماجی عوامل کی پیدائش میں کم نہیں کیا جا سکتا۔ سچ، یقین کا متبادل ہوتا ہے۔ لیکن ابھی تک سچائی اور غلطی موجود ہے۔

علم، ثقافتی اور تاریخی طور پر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ علم کی ترویج میں اصطلاحات کا اضافہ، ایک تاریخی نازک مظہر ہے۔ سائنس یا فلسفے میں مراجعت کا عمل ممکن ہے اور بعض اوقات، ایسا واقع بھی ہوتا ہے۔ لیکن انسانی علوم میں ترقی بلاشبہ، وسعت کی حامل ہے۔ ہم تقابلی نظریات کو اصلی محاسن جو کہ حقیقت کی وضاحت ہیں، کی بنیاد پر مدلل انداز میں جانچ سکتے ہیں۔ ہم ایسا سائنسی اور روزمرہ زندگی دونوں میں کر سکتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکے تو ہم اپنی دنیاوی سرگرمیوں میں زیادہ کامیاب نہیں ہو پائیں گے۔ سائنس کم از کم ایک حوالے سے محض آراستگی اور وسعت کی حامل ہے جسے ہم روزمرہ زندگی کے عملی ضابطوں میں استعمال کرتے ہیں۔ تاہم، یہ ایک آراستگی ہے! اور حقیقت پسند تنقید ایک فلسفے کے طور پر آراستگی کی ممکنہ بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لئے ہے۔

دراصل سماجی سائنسی عمل، سوشل سائنس دانوں کی پختہ کارگزاریوں پر انحصار کرنے والی روزمرہ زندگی کی نسبت سماجی مظہر کی بہتر اور وسیع وضاحت کرنے کیلئے کامیاب تکنیکیں وضع کرتا ہے۔ حقیقت پسند تنقید کا یہ نقطۂ نظر قدرے مشکل ہے کہ سوشل سائنس کے امکانات کی فلسفیانہ بنیادوں کا شعوری ادراک، سوشل سائنس (نیچرل سائنس بھی) کو عملی طور پر بہتر اور زیادہ کامیاب بنائے گا۔

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

جمالیاتی کیفیات کا شاعر

''جدید غزل ایک بے کلچر معاشرے کی پیداوار ہے۔ ہم اپنا پُرانا کلچر گُم کر چکے ہیں اور نیا ابھی پیدا نہیں ہوا، اس لحاظ سے جدید غزل صرف خلا میں سانس لے رہی ہے۔ ہمارے پاس جذبات ہیں، محسوسات ہیں، تجربات ہیں مگر وہ کیمیا کہاں ہے جو اس مس خام کو زرِ خالص کر دے۔'' ان خیالات کا اظہار معروف نقاد و شاعر سلیم احمد نے جدید غزل کے حوالے سے اپنی ایک تحریر میں کیا۔ جس میں انہوں نے رئیس فروغ، حفیظ جالندھری اور انور شعور کی شاعری کا جائزہ لیا تھا۔ مگر اب غزل کا سفر ان کے فیصلے سے آگے بڑھ چکا ہے۔ جو نوجوان شعراء غزل کی آب و تاب میں اضافہ کر رہے ہیں ان میں لیاقت علی عاصم، اجمل سراج، اکبر معصوم، انعام ندیم اور داؤد رضوان نے جدید غزل میں نئے اسالیب کا اضافہ کیا ہے اور امکانات کے نئے در وا کیے ہیں۔

کاشف حسین غائر بھی اسی قبیلے کا فرد ہے، جس کے لہجے میں اردو غزل کی تابنا کی اور منفرد اُسلوب کے آثار ابتدائے سفر سے نمایاں ہیں۔ کاشف حسین غائر کمالِ ہنرمندی سے شعر کہتا ہے مگر صرف ہنرمندی ہی اچھی شاعری کی دلیل نہیں، اس کے علاوہ بھی غزل میں تغزل، جس کو غزل کی جان کہتے ہیں، کی ضرورت اس حکم کے ساتھ ہے کہ وہ اس کی رمزی اور ایمائی کیفیت سے مشروط ہو اور شاعر اس نقطے سے بھی آگاہ ہو کہ صنائع و بدائع لفظی و معنوی کے استعمال کی غایت کیا ہے۔ عابد علی عابد اس عمل کو تخلیق کی پُل صراط سے تعبیر کرتے ہیں اور اس پُل صراط پر ایک ہجوم کے قدم لڑکھڑا چکے ہیں۔ کاشف کی غزل میں رمزیت اور ایمائیت کے ساتھ جذبات کی شدت، خیال کی بلندی اور معنی آفرینی پوری جمالیات کے ساتھ نظر آتی ہے۔

میرے دوست منور سراج کا کہنا ہے کہ آرٹ اور عبادت میں جھوٹ نہیں چلتا۔ کاشف آرٹ یا شاعری کی ابدی صداقت پر یقین رکھتا ہے۔ کاروبارِ غم دنیا میں سر کھپانے کے باوجود مکمل محویت اور دیوانگی کے ساتھ شاعری پر سوچتا ہے، ذہن کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر شعر کو خیال سے الفاظ میں ڈھالتا ہے اور فنی و جمالیاتی دل کشی سے پوری طرح مطمئن ہو کر اسے اپنی بیاض میں تحریر کرتا ہے۔

زمیں کے جسم پر قبریں نہیں ہیں
خیالِ رفتگاں رکھا ہُوا ہے
سرِ مژگاں مرے آنسو نہیں ہیں
سلوکِ دوستاں رکھا ہُوا ہے
عشق میں یار یہ من و تُو کیا

لفظ اک ''ہم'' ہے اور ہم ہیں بس

یہ عشق کارِ زیاں ہے تو ہو کسی کے لیے
ہمیں تو کوئی خسارا نظر نہیں آتا
نیند اُڑتی رہے گی آنکھوں سے
جشن یہ رات بھر رہے گا کیا
مجھ میں آباد ہے جو سنّاٹا
کیا مری ہاؤہُو سے نکلے گا
کیا مکیں صرف مکیں ہوتے ہیں
کیا مکاں صرف مکاں ہوتا ہے
لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں
دشت آباد کہاں ہوتا ہے
ختم ہوتا ہے کہاں کارِ جہاں
اِک نہ اِک دردسری رہتی ہے

سرِ مژگاں، سلوکِ دوستاں، قبروں کو خیالِ رفتگاں سے تشبیہ دینا، نیند نہ آنے کی اذیت کو جشن سے تعبیر کرنا اور کارِ جہاں کو دردسری لکھنا کاشف کا ہی کمال ہے۔ گو کہ وہ شہرِ سخن میں نووارد ہے، مگر جس طرح شاعری عطیۂ الٰہی ہے، اسی طرح تمیزِ فن بھی عطیۂ الٰہی ہے۔ کاشف اپنی شاعری کا سب سے بڑا ناقد خود ہے، وہ خیال کی اہمیت، الفاظ کے قبح اور قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہے اور کوئی بھی فنکار اپنے طور سے تخلیقات میں بلندی اور رفعت پیدا نہیں کر سکتا، جب تک اس کی فطرت میں عظمت نہ ہو۔ ذوق نے غزل میں بہت زور مارا لیکن اس کا فن اکتساب سے آگے نہیں بڑھ سکا اور غالب کی فطری سطوت و جمال کی سلطنت آج بھی مائل بہ وسعت ہے۔ کاشف کے ہاں خیال کی رفعت اور جذبات کی شدت ایسے عالم تخلیق کرتی ہے۔

خواب کی جادوگری رہتی ہے
نیند آنکھوں میں بھری رہتی ہے
دُھوپ سایا تلاش کرتی ہوئی
آج میرے مکان تک پہنچی
وہ دُنیا جو مری دُنیا نہیں ہے
میں اس سے استفادہ کر رہا ہوں

ہوائیں آتی ہیں، میرا طواف کرتی ہیں
میں اِک دِیا ہوں تری رہگزر میں رکھا ہوا

تشبیہ واستعارہ، علامت وکنایہ رنگ بدل بدل کر کاشف کی غزل میں نمودار ہوتے ہیں، جس سے اس کی روانیِ طبع کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہر اچھا شاعر نئے نئے بلیغ استعارے استعمال کرتا ہے اور جب جذبات جوش پر ہوں تو بے شمار استعارات، تلازمات اپنے ساتھ لاتے ہیں اور ادراک وشعور ان کی تہہ داری اور باطنی وظاہری حُسن میں گُم ہوجاتے ہیں۔ اس لیے لازمی ہے کہ شاعر کو زبان پر قدرت اور الفاظ کے استعمال پر مہارت ہو۔ کاشف اس حوالے سے خوش نصیب ہے کہ اسے یہ ہُنر عطا ہُوا ہے۔ اس کی یہ ہُنر وری دیکھیے:

مرے تو خواب مٹی ہو رہے ہیں — درودیوار کو کیا ہو رہا ہے
بہت پُرزور ہے اس کا بیاں بھی — ہماری خامشی بھی کم نہیں ہے
سفر میں رکھے نئے منظروں کی چاہ مجھے — کہیں غبار نہ کر دے یہ گردِ راہ مجھے
یہ دُنیا ہے کہ دشتِ کربلا ہے — یہ دریا ہے کہ سیلِ غم ہمارا
ہوئے ہیں قتل ہم اپنے ہی ہاتھوں — کرے گا کیا کوئی ماتم ہمارا
نیند ایسی کہ آنکھ کھل جائے — خواب ایسا کہ ٹوٹتا ہی نہیں
اک قہقہوں کی گونج تھی جو گونجتی رہی — اک دل کا شور تھا جو سُنا تک نہیں گیا
یہ ملاقات کہیں خواب نہ ہو — میں نے اس شخص کو چھُو کر دیکھا
ہمیں سے کرتا رہا گفتگو ہماری طرح — تھا آئینے میں کوئی ہُو بہُو ہماری طرح

کاشف کی غزل غالب کے بُتِ طنّاز کی طرح سو ادائیں دکھاتی ہے اور اپنے دامن میں زندگی کا رنگ سموئے ہوئے ہے۔ عصرِ موجود کے سانحوں اور وجودِ آدم میں ہونے والی شکست وریخت کے سبھی لمحے اس کے اشعار میں سانس لیتے ہیں۔

غالباً وقت کی کمی ہے یہاں
ورنہ ہر چیز دیدنی ہے یہاں

کاشف ادب برائے محظوظیت کے بجائے ادب برائے زندگی کا قائل ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آنے والے دور میں کاشف حسین غائر اپنے عہد کا نمایاں ترین شاعر ہوگا۔ وہ اُردو شاعری خصوصاً اردو غزل کا بہترین سرمایہ ہوگا۔ خدائے حرف وصوت اسے استقامت اور کمالِ آفرینی عطا کرے۔

☆☆☆

ایم۔ خالد فیاض

تحقیق پر تنقیدی روّیے کی سمت

''انگارے'' کے اکتوبر ۲۰۰۵ء کے شمارہ میں طاہر عباس کا مضمون ''منٹو: ماہ وسال کے آئینے میں (تحقیقی جائزہ)'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور کے ایم۔اے (اردو) کے متعلم اور ''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)'' کے مرتب شمشیر حیدر شجر کے ایک مضمون ''منٹو: ماہ وسال کے آئینے میں'' کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ پیش کیا۔ انہوں نے اس مضمون کو ''اوّل تا آخر چوری شدہ'' (انگارے ۳۴، شمارہ اکتوبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۰) قرار دیا ہے اور اس کے لیے انہوں نے دلیل یہ دی ہے کہ شمشیر نے ''پورے مضمون میں کہیں بھی اس بات کی نشان دہی نہیں کی کہ انہوں نے منٹو کی شخصی اور فنی زندگی سے متعلق اتنی معلومات کہاں سے اخذ کیں۔'' (انگارے، ایضاً ص ۱۰)

اس کے بعد طاہر نے شمشیر کے مضمون کے دو حصے بتائے اور کہا کہ پہلا حصہ تو ''حرف بہ حرف ڈاکٹر علی ثناء بخاری کے پی ایچ۔ڈی کے غیر مطبوعہ مقالے، سعادت حسن منٹو، سوانح اور ادبی کارنامے سے سرقہ کیا گیا ہے۔'' (انگارے، ایضاً ص ۱۱) اور دوسرے حصے کے بارے میں انہوں نے بتایا کہ شمشیر نے یہ حصہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری، ڈاکٹر انیس ناگی اور ڈاکٹر برج پریمی کے نسخوں سے اخذ کیا ہے۔ طاہر لکھتے ہیں کہ

> ''مصنف (شمشیر حیدر شجر) نے اس اشاریے (مضمون کا دوسرا حصہ) کو مرتب کرتے ہوئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اُس نے تینوں نسخے سامنے رکھ کر اور اُسے جو مواد جہاں سے مکمل نظر آیا اُسے اپنا لیا اور تینوں نسخوں کے درمیان پائے گئے اختلافات کو حواشی میں درج کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ شمشیر حیدر شجر نے محض ان اختلافات کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجوہات اور درست نسخے کی نشان دہی کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اس کی نشان دہی نہیں کی۔ وہ ان اختلافات کی وجوہات بیان کر سکتے تھے۔ اگر انہوں نے منٹو کی تصنیفات کے تمام نسخے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوتے۔ تین نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک فہرست بنا دینا اور اُن کے اختلافات بیان کر دینا تقابلی جائزہ تو ہوسکتا ہے تحقیقی جائزہ ہرگز نہیں۔ انہوں نے بھی ان غلطیوں کو دُہرایا جو انیس ناگی نے کی تھیں۔ یوں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس اشاریے کی ترتیب میں ان کے ماخذات کون کون سے تھے۔'' (انگارے، ایضاً ص ۱۴ تا ۱۵)

میں طاہر کی اس بات سے متفق ہوں کہ شمشیر کا مذکورہ بالا مضمون تحقیقی نہیں تقابلی کہا جا سکتا ہے اور ممکن یہی ہے کہ شمشیر نے منٹو کے افسانوی مجموعوں کو براہِ راست نہیں دیکھا اور یہ بھی درست ہے کہ شمشیر کے مضمون میں کافی اغلاط موجود ہیں مگر یہ دعویٰ کہ شمشیر نے یہ مضمون چوری کیا ہے اور اپنے ماخذات کی قطعاً نشان دہی نہیں کی، درست نہیں۔ کیونکہ شمشیر حیدر شجر نے اپنے مضمون میں کہیں یہ تاثر دینے کی کوشش نہیں کی کہ انہوں نے یہ مضمون اپنی ذاتی تحقیق کے بل بوتے پر تحریر کیا ہے۔ انہوں نے مضمون کے آخر میں با قاعدہ حواشی اور حوالہ جات درج کیے ہیں اور ان کا سرسری مطالعہ بھی یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ شمشیر نے منٹو پر لکھے گئے کن کن تحقیقی نسخوں پر انحصار کیا ہے اور مدد لی ہے اور طاہر نے بھی یہ نتیجہ کہ یہ مضمون تحقیقی نہیں تقابلی ہے، انہی حواشی اور حوالہ جات کے مطالعہ سے اخذ کیا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شمشیر نے اپنے ماخذات کو چھپانے کی کوشش ہرگز نہیں کی۔ اس ثبوت کے لیے اُن کا حوالہ نمبر۱۴ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ''منٹو کے ڈرامے'' کے اشاعتی ادارہ اور سنِ اشاعت کے ضمن میں تحریر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اس حوالے کا ماخذ صرف ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا مقالہ ہے کیونکہ ڈاکٹر برج پریمی نے اس کا ذکر نہیں کیا اور ڈاکٹر انیس ناگی نے اسے مکتبہ اردو لاہور کی طرف سے ۱۹۳۴ء کا شائع شدہ بتایا ہے جو قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔''
>
> (''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)''، ص ۲۸)

غرض یہ کہ شمشیر حیدر شجر نے صاف صاف اپنے ماخذات کی نشان دہی کی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ماخذات کی نشان دہی کا جو فارمولا طاہر کے ذہن میں ہو، اُس سے شمشیر کا طریقہ کار نہ ملتا ہو، لیکن اس وجہ سے اُن پر چوری کا الزام لگانا درست نہیں۔

دوسری طرف طاہر اپنے مضمون کے عنوان میں ''تحقیقی جائزہ'' کے اضافے سے اس بات کے پابند ہو گئے ہیں کہ وہ ہر بات بڑی چھان بین کے ساتھ درج کریں۔ جب کہ کچھ تحقیقی غلطیاں اُن سے بھی سرزد ہو گئی ہیں۔ سب سے پہلے تو بتایا کہ پہلا ''حصہ کتاب کے صفحہ نمبر ۱۱ تا ۱۵ پر مشتمل ہے۔ جبکہ مضمون کا دوسرا حصہ بعنوان ''منٹو کی تصنیفات کا اشاریہ، صفحہ نمبر ۱۶ سے ۲۹ تک ہے'' (انگارے، ایضا، ص ۱۱)۔

اب اگر ہم شمشیر کے مضمون پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ پورا مضمون تو صفحہ ۱۱ سے ۲۹ تک ہے مگر آخری چند صفحات حواشی اور حوالہ جات کے لیے وقف ہیں۔ جن پر مضمون کے دونوں حصوں کے حوالے شامل ہیں۔ لہٰذا حواشی اور حوالہ جات پر مبنی صفحات کو مضمون کے محض دوسرے حصے میں ڈال دینا مناسب نہیں اور ساتھ یہ بھی کہ پہلا حصہ صفحہ ۱۵ پر ختم نہیں ہوتا بلکہ صفحہ ۱۶ کے وسط پر جا کر اختتام کو پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہم شمشیر کے مضمون کے دو حصوں کے صفحات نمبر کی معلومات یوں درج کریں گے کہ مضمون کا

پہلا حصہ صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۶ کے نصف اوّل تک اور دوسرا حصہ صفحہ ۱۶ کے نصف آخر سے صفحہ ۲۶ کے نصف اوّل تک اور اُس کے بعد صفحہ ۲۶ کے نصف آخر سے صفحہ ۲۹ تک حواشی و حوالہ جات ہیں۔

ایک جگہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ شمشیر کا یہ مضمون چوری شدہ ہے، طاہر نے شمشیر کے درج کردہ منٹو کے افسانوی مجموعہ ''دھواں'' کے سنِ اشاعت کا ڈاکٹر علی ثنا بخاری کے مقالے میں درج شدہ سن سے تقابل کیا ہے، لیکن وہ شمشیر کا اس ضمن میں دیا گیا حوالہ نمبر ۱۶ شاید نہیں دیکھ سکے۔ جہاں شمشیر نے صاف لکھا ہے کہ ''اس کے سال اشاعت میں بھی ڈاکٹر برج پریمی اور ڈاکٹر علی ثنا بخاری متفق ہیں، لیکن ڈاکٹر انیس ناگی نے سالِ اشاعت ۱۹۳۸ء دیا ہے۔ ادارہ اشاعت تینوں میں مشترک ہے۔'' (سعادت حسن منٹو- پچاس برس بعد، ص ۲۸) جب کہ اس سلسلے کی وضاحت کرتے ہوئے طاہر خود اپنے دعوؤں کی تصدیق اور ماخذ کی نشان دہی کرنے سے گریز کر گئے۔ طاہر لکھتے ہیں:

> ''انیس ناگی نے سنِ اشاعت ۱۹۳۸ء بتایا ہے جو غلط ہے۔ جہاں تک افسانوں کی تعداد کا تعلق ہے وہ تینوں کے ہاں برابر ہے، لیکن ان تینوں کے ہاں ان افسانوں کی ترتیب مختلف ہے۔ ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے تمام افسانوں کے ساتھ اُن کے صفحہ نمبر بھی درج کیے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی ایڈیشن کے افسانوں کی ترتیب مختلف ہو۔'' (انگارے، ایضاً، ص ۱۵)

یہاں طاہر کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ انیس ناگی کا سنِ اشاعت غلط ہے اور افسانوں کی کون سی ترتیب درست ہے ''دھواں'' کے اصل نسخے کا حوالہ دینا چاہیے تھا تا کہ اُن کی بات سند حاصل کر لیتی لیکن یہاں بھی یہی معلوم ہوا کہ وہ بھی اصل ماخذ کی بجائے ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور ڈاکٹر انیس ناگی کے ماخذات پر بھروسہ کرتے رہے ہیں۔

شمشیر حیدر شجر کے درج کردہ ''دھواں'' کے سنِ اشاعت کے ماخذ کی نشان کرنے سے زیادہ بہتر ایک اور تحقیقی اَمر تھا۔ شمشیر نے ''دھواں'' کے افسانوں کی جو ترتیب درج کی ہے، اُس میں ایک افسانہ ''گرم کوٹ'' لکھا ہے اور حواشی نمبر ۱۷ میں اس کی وضاحت یوں کی ہے کہ ''ڈاکٹر انیس ناگی اور ڈاکٹر علی ثنا بخاری نے اس افسانے کا نام ''گرم سوٹ'' درج کیا ہے۔'' (سعادت حسن منٹو- پچاس برس بعد، ص ۲۸) لیکن شمشیر نے یہ وضاحت نہیں کی کہ پھر انہوں نے ''گرم کوٹ'' کہاں سے اخذ کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد نے بھی اپنے مطبوعہ مقالہ ''اردو افسانہ- تحقیق و تنقید'' میں اسے ''گرم سوٹ'' ہی لکھا ہے۔ اگر چہ شمشیر کے پچھلے حواشی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر برج پریمی کے نسخے سے اسے اخذ کیا ہوگا مگر اس بات کی وضاحت ضروری تھی کہ ڈاکٹر انیس ناگی، ڈاکٹر علی ثنا بخاری اور ڈاکٹر انوار احمد جیسے محققین ''گرم کوٹ'' کو ''گرم سوٹ'' کیوں کر لکھ گئے۔ طاہر اگر شمشیر کے چھوڑے ہوئے ایسے تحقیقی خلا پُر کرتے تو زیادہ سود مند ہوتا۔

بہرحال یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ شمشیر کے مضمون میں بڑی حدتک تحقیقی اغلاط موجود ہیں اور طاہر نے کسی حدتک ان کی نشان دہی کی بھی ہے مگر اُن کا زیادہ زوران اغلاط کی درستی کے بجائے اس مضمون کو چوری شدہ ثابت کرنے پر صرف ہوا ہے۔ جب کہ یہ الزام درست بھی نہیں اور دوسرا یہ کہ شمشیر حیدر شجر ابھی ایم۔اے کے متعلم ہیں اور یہ ایک متعلم کی کاوش ہے۔ اس لحاظ سے وہ اپنی تحقیقی اغلاط (جس قدر ہیں) پر ہمدردانہ رویے کے متقاضی ہیں۔ طاہر جانتے ہوں گے کہ یہ ہمارے ہاں اکثر ڈاکٹر حضرات ایسی ایسی تحقیقی کوتاہیوں سے کام لیتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور یہ پریشانی لاحق ہوجاتی ہے کہ ایسے ڈاکٹرز کی تعداد اگر روز بروز بڑھتی گئی تو تحقیق کا مستقبل کیا ہوگا۔ اس حوالے سے میں یہاں ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی مثال پیش کروں گا جنھوں نے منٹو پر شمشیر حیدر شجر کی طرز کا کوائف نامہ تیار کرکے اپنی کتاب ''سعادت حسن منٹو، تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' میں شامل کیا ہے۔ اس ''کوائف نامہ'' کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ شمشیر نے اپنی بساط کے مطابق کافی بہتر کام کیا ہے۔

طاہر نے اپنے مضمون کے آغاز میں ۲۰۰۵ء میں منٹو پر شائع ہونے والی جن پانچ کتابوں کی فہرست درج کی ہے۔ اُن میں ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی یہ کتاب بھی شامل ہے، لیکن طاہر سے یہاں بھی ایک چھوٹی سی غلطی ہوگئی۔ اس کتاب کا اشاعتی ادارہ وہ غلط لکھ گئے ہیں۔ طاہر نے ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی اس کتاب کا اشاعتی ادارہ ''سنگِ میل پبلی کیشنز'' لاہور درج کیا ہے۔ (انگارے، ایضاً، ص۱۰) جب کہ یہ کتاب ''سنگت پبلشرز لاہور'' کی جانب سے شائع ہوئی ہے اور شاید طاہر، ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی اس کتاب پر غور کرنا بھول گئے ورنہ وہ یقیناً شمشیر حیدر شجر کی بجائے اورنگ زیب عالمگیر پر ایک تحقیقی وتنقیدی مضمون لکھنے پر مجبور ہوجاتے۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی سنگت پبلشرز کی جانب سے اس سال بیک وقت پانچ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم، غلام عباس، سعادت حسن منٹو اور انتظار حسین کے الگ الگ پانچ پانچ منتخب افسانے اور اُن کے تجزیے پیش کیے گئے ہیں اور ان تجزیوں سے پہلے مصنف کے حالاتِ زندگی اور اُس کی تصانیف پر ''کوائف نامہ'' کے عنوان سے ایک ایک مضمون شامل کیا گیا ہے اور ساتھ ہر ایک افسانہ نگار کے فن پر بھی ایک ایک مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ ان پانچ کتابوں کے افسانوی تجزیوں کا کیا معیار ہے؟ ہر افسانہ نگار کے فن پر لکھے گئے مضامین کس اہمیت کے حامل ہیں؟ اور منٹو کے علاوہ دیگر افسانہ نگاروں کے کوائف ناموں کی کیا تحقیقی صورت حال ہے؟ سردست ہم ان موضوعات سے صرف نظر کرتے ہوئے محض سعادت حسن منٹو کے ''کوائف نامہ'' تک اپنی بات کو محدود رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کے اس مضمون کے بھی دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں منٹو کا نام، پیدائش، والدین کے نام، والدین کی سنِ وفات، بیوی، شادی، تعلیم، ملازمت اور منٹو کی ہجرت کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

اس حصے کے شروع میں ہی نظر ڈالیں تو منٹو کے والد کا سنِ وفات یوں لکھا نظر آتا ہے ''۳/فروری ۱۹۳۳ء، عمر ۷۰ سال'' (سعادت حسن منٹو۔ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' سنگت پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۱) جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ڈاکٹر علی ثنا بخاری کی تحقیق کے مطابق منٹو کے والد غلام حسن ۱۸۵۵ء کو پیدا ہوئے اور ۱۹۳۲ء کو انتقال کیا۔ اس حساب سے اُن کی عمر ۷۷ برس بنتی ہے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر نے سنِ وفات بھی غلط درج کیا ہے اور سنِ پیدائش بتائے بغیر غلط عمر تحریر کی ہے۔ اگر انہیں یقین ہے کہ اُن کی عمر ۷۰ برس تھی تو پھر اس حساب سے اُن کا سنِ پیدائش ۱۸۶۳ء درج کردیتے لیکن ایسا بھی نہیں۔ اسی طرح منٹو کی والدہ کا نام سردار بیگم کی بجائے بی بی جان لکھا ہوا ہے۔ منٹو کی شادی کی تاریخ بھی غلط درج کی ہے۔ سن ۱۹۳۹ء کی بجائے ۱۹۳۶ء رقم کیا ہے اور سب سے بڑی بات کہ اپنے ان دعوؤں کے لیے کسی قسم کی اسناد مہیا کرنے سے قطعاً گریز برتا ہے۔ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کی اس خود ساختہ تحقیق کا اصل ماخذ کیا ہے اور جب ہم اس مضمون کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں جہاں منٹو کی تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے تو بے اختیار سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے کہ یہ کیا ہے۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے ایسی معلومات کس کے لیے رقم فرمائی ہیں۔ نہ تو مجموعوں کی تعداد پوری نہ سنِ اشاعت میں احتیاط ضروری اور جس طرح حواشی وغیرہ بنائے گئے ہیں انہیں یا تو ڈاکٹر صاحب خود سمجھیں یا خدا سمجھے۔

انہوں نے منٹو کے صرف چھ افسانوی مجموعوں کی تفصیل دی ہے باقی سب گول کر گئے ہیں۔ حتیٰ کہ جن پانچ افسانوں کا تجزیہ پیش کیا ہے، وہ منٹو کے جن افسانوی مجموعوں میں شامل ہیں، ان کی تفصیل بھی کم از کم احتیاط سے نہیں دی۔ عام قاری اُلجھن ہی میں پڑا رہے کہ ڈاکٹر اورنگ زیب نے جن افسانوں کا تجزیہ کیا ہے، ان میں سے ''ممد بھائی''، ''سہائے'' اور ''گورمکھ سنگھ کی وصیت'' منٹو کے افسانے ہیں بھی یا نہیں۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے منٹو کے افسانوی مجموعہ ''دھواں'' کے ساقی بک ڈپو، دہلی سے شائع ہونے والے نسخے کا سنِ اشاعت ۱۹۶۱ء درج کیا ہے۔ خاکوں کی کتاب ''گنجے فرشتے'' کے خاکوں کے عنوان لکھتے ہوئے منٹو کے خاکہ ''میرا صاحب'' کو ''میرا صاحب میرا گھر'' لکھ دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر صاحب کے اس مضمون پر مزید کچھ لکھنا یا اس کا تنقیدی و تحقیقی جائزہ لینا، کم از کم میرے بس سے تو باہر ہے۔ یہ محض دیکھنے کی چیز ہے۔ ہاں ایک افادیت اس مضمون کی ضرور ہے کہ یہ نئے محققین کے لیے عبرت کا سامان فراہم کرنے میں بدرجہ غائت معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

بہرحال اب یہاں میں کہنا یہ چاہوں گا کہ یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تحقیقی کاوشوں پر کڑی سے کڑی نظر رکھیں اور خاص طور پر اس عہد میں اس کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ جس عہد میں تحقیق کی اہمیت روز بروز واضح ہوتی چلی جارہی ہے، لیکن اس کے لیے ایک مناسب طریقۂ کار وضع ہونا چاہیے اور ایک مناسب تنقیدی اُسلوب کو اپنانا چاہیے۔ ڈاکٹر حضرات جو سند یافتہ ہیں اور جو زیادہ تحقیقی گمراہیاں پھیلانے میں پیش پیش ہیں، ان پر ہماری گرفت زیادہ سخت ہونی چاہیے۔ لیکن جو تحقیق کے طلبا

ہیں اور خلوص کے ساتھ تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں، اُن کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے وقت ہمارا تنقیدی رویہ راہنمایانہ اور ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ جبکہ عام طور پر اس کے اُلٹ رویہ سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات کی غلطیوں پر ہم کم وبیش خاموش رہتے ہیں کیونکہ اُن کی کوتاہیوں کو منظرِ عام پر لانے میں اکثر وبیشتر ہمارے ذاتی تحفظات کو نقصان پہنچنے کا خدشہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم تحقیق کے طلبا پر چڑھ دوڑتے ہیں یا پھر تحقیق پر ہماری تنقیدی تحریریں، محقق کی دوستی یا دشمنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اپنے فیصلوں اور رویوں کا تعین کرتی ہیں۔ یہ رویہ درست نہیں۔ اگر ہم تحقیق کو باعتبار مقام بخشنا چاہتے ہیں تو پھر تحقیق کو اپنے ذاتی تعصّبات سے، تحفظات سے اور مفادات سے مقدم رکھنا ہوگا۔

ابھی پچھلے دِنوں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد کے مجلّہ ''تخلیقی ادب'' کا دوسرا شمارہ پڑھنے کو ملا۔ اُس میں شعبہ آئی۔ اے۔ ایس کی ایک ڈاکٹر شذرہ منور کا مضمون ''آگ کا دریا-ایک جائزہ'' شائع ہوا ہے جس میں وہ سجاد حیدر یلدرم کو قرۃ العین حیدر کا نانا بتاتی ہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

''قرۃ العین حیدر کے نام سے کون واقف نہیں۔ اُن کی والدہ نذر سجاد حیدر نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی اردو زبان کی مایہ ناز مصنفہ تھیں بلکہ اپنے دور کی بہت بڑی رفاہِ نسواں کی سرکردہ تھیں۔ اُن کے نانا سجاد حیدر یلدرم اردو زبان کے عالمگیر شہرت یافتہ مصنف اور تحریکِ پاکستان کے ایک اہم رکن تھے۔''

(تخلیقی ادب، شمارہ ۲، ص ۳۱۱)

تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں ڈاکٹر حضرات کا یہ حال ہو وہاں تحقیقی متعلموں پر ایسی سخت گرفت کیا۔ لیکن اس کا مطلب بہر حال یہ نہیں کہ نوجوانوں اور طلبا کی تحقیقی کوتاہیوں کو بالکل نظر انداز کیا جائے، کوتاہیوں کی نشاندہی ضروری ہے مگر غرض صرف اتنی ہے کہ اُن کے ساتھ ہمارا انداز ہمدردانہ ہونا چاہیے۔ ہمارا مقصد حوصلہ شکنی کرنا نہیں بلکہ حوصلہ افزائی کرنا، ہونا چاہیے۔ ہاں ڈاکٹر حضرات اگر تحقیقی کوتاہیوں کے مرتکب ہوں تو کسی رعایت کے مستحق نہیں۔ بلکہ ہمیں کوئی ایسا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنا چاہیے جس میں ڈاکٹر حضرات کے تحقیقی مقالات اور دیگر تحقیقی کاوشوں کا تنقیدی جائزہ لیا جاتا رہے۔

☆☆☆

تنویر صاغر

انیس ناگی کی نظم میں وجودی اصطلاحات

وجودیت (Existentialism) فکر کی ہم آہنگی اور مطابقت کی بنا پر، بیسویں صدی میں شہرت پانے والا، اہم مکتبۂ فکر ہے۔ جس کا بانی کرکیگارڈ مانا جاتا ہے، مگر اس کے کلاسیکل خطوط، ہیگل کی فکریات میں بھی ملتے ہیں۔ کرکیگارڈ، انیسویں صدی کا فلسفی تھا مگر اس کے بعد بیسویں صدی میں سارتر نے وجودیت کی فکر کو مربوط انداز میں پیش کیا۔ مگر اس کے علاوہ کانٹ، شوپنہار، نطشے، کارل جاسپرز، ہائیڈیگر، مارسل، کیمیو، کافکا جیسی اہم شخصیات نے بھی اپنی فکریات میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا۔

وجودیت کی مختلف صورتوں کو کرکیگارڈ اور سارتر کی فکریات کی روشنی میں بیان کرنا زیادہ بہتر ہوگا کیوں کہ یہ دونوں فلاسفر ہی اس مکتبۂ فکر کے اہم مفکر مانے جاتے ہیں۔

کرکیگارڈ کے فلسفے میں فرد کو بہت اہمیت حاصل ہے اور اُس نے 'وجود' کو 'جوہر' پر مقدم ٹھہرایا ہے۔ اُس کے مطابق ہر فرد ایک جداگانہ اور الگ تشخص رکھتا ہے اور اپنے ہر عمل کے ارتکاب میں آزاد ہے۔ کرکیگارڈ کے فلسفے کا آغاز بھی فرد ہے اور اختتام بھی فرد۔ اس حوالے سے وہ کہتا ہے:

''اگر میں نے اپنی قبر کے لیے کوئی کتبہ تجویز کیا وہ ہوگا____ وہ فرد۔''

سارتر انسان، کائنات اور انتخابِ آزادی کی راہیں متعین کرنے میں بہت کوشش کرتا رہا ہے۔ سارتر کے اکثر ناولوں اور تمثالوں میں تحریک آزادی، تحریک مقاومت اور قیدیوں پر روا رکھے گئے ظلم کا ذکر ملتا ہے۔ بعض اوقات وہ اپنے ہم وطنوں کو جرمن کے خلاف اُبھارتا ہے اور بغاوت کی ترغیب دیتا ہے اور اس دعوت کی پیش کش سرِ عام کرتا ہے۔

سارتر انسان کی منطقی آزادی کا قائل ہے۔ انسان کی آزادی اُس کی شخصیت اور ذات کے 'عدم' سے 'وجود' میں آئی ہے۔ سارتر کے نزدیک آزادی یہی ہے کہ انسان ہمیشہ منطقی رہے۔ سارتر دنیا میں انسان کی موجودگی کو بے معنی قرار دیتا ہے۔ اُس کے نزدیک انسان اپنی کائنات، اپنی موجودگی، اخلاقیات، اعمال ہر شے خود مرتب کرتا ہے۔ سارتر جس آزادی کا قائل ہے وہ آزادی، سماج اور سماجی نظام میں تغیر ہے۔

وجودیت کی مختلف جہتوں کے زیرِ اثر اردو ادب میں جو تخلیقات سامنے آئیں اُن میں شاعری، ناول، ڈرامہ، افسانہ جیسی اصناف شامل ہیں۔ اردو شاعری میں مغائرت، اجنبیت، یاسیت، لاتعلقی، افراتفری، تشکیک، ہیجان، انتشار ایسے وجودی عناصر ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے پایاں وسعت پذیر ہو رہے ہیں۔ اوّل اوّل نظم گو شعراء میں وجودی عناصر کو شاعری میں جگہ دینے والوں میں انیس ناگی کو باوا آدم کی حیثیت حاصل ہے۔

انیس ناگی کے ہاں موضوعات کا تنوع ہے جو کہ وجودی مکتبۂ فکر سے راست انعکاس کا عملی ثبوت ہے۔ انیس ناگی کی نظم تدریجی ارتقاء کے دو مراحل پر مبنی ہے۔ پہلا مرحلہ اضطراب اور دوسرا اضطراب سے نجات کا ہے۔ پہلے مرحلے میں اضطراب، بیگانگی، دُکھ، حزن، خوف، مایوسی شامل ہیں اور یہی وقوعات وجود کی تنہائی کے غماز ہیں جو آگے چل کر اُن کی نظم میں حبس اور گھٹن پر منتج ہوتے ہیں۔

دوسرا مرحلہ متذکرہ بالا محسوسات سے نجات کا حامل ہے یہ مرحلہ وجود سے بُعد کا نہیں بلکہ وجود سے ہم رشتگی کا اثبات ہے۔ احساس کی یہ نہج آزادی اور وابستگی سے انسلاک کا بین اظہار ہے جو کہ 'وجودیت' کا ارتقائی ثمر ہے۔

سرِ دست انیس ناگی کی نظم میں وجودی اصطلاحات کی کارگزاری مقصود ہے۔ انیس ناگی کی نظم میں وجودی اصطلاحات کثیر الجہاتی پہلوؤں کی عکاس ہیں جو کہ متاخرینِ وجودیت اور معاصرینِ وجودیت سے ممیّز ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد مفہوم کی ادائیگی کا سالم اظہار ہیں۔

وجودی اصطلاحیں مظہریاتی، امکانی اور عارضی پہلو رکھتی ہیں۔ کثیر مستعمل وجودی اصطلاحات میں دہشت، بیگانگی، نیستی، Nausea (متلی، کراہت)، حُریت (آزادی)، وابستگی، خوف، موت، بے خوابی، تنہائی شامل ہیں۔ انہی وجودی اصطلاحات سے انیس ناگی نے بھی فیض اُٹھایا ہے۔ انیس ناگی کے اس فیضان سے اردو ادب کا دامن زرخیز اور وسیع ہوا ہے۔

دہشت وجودی اصطلاح ہے جسے سب سے پہلے کرکیگارڈ نے استعمال کیا، کرکیگارڈ چوں کہ ایک مذہبی شخص تھا اس لیے وہ کہتا ہے دہشت کے سبب انسان اپنی عاقبت کو سنوار کر ابدیت حاصل کر سکتا ہے اور وہ اسے امکانی صورت میں استعمال کرتا ہے۔

ہائیڈیگر اسے مظہریاتی صورت میں استعمال کرتا ہے اور دہشت کو انسان کی ہستی، وجود کا ماخذ اور منبع قرار دیتا ہے۔ جب کہ انیس ناگی کے نزدیک دہشت وہ ساعت ہے جب انسان پُرسکون زندگی گزارتے ہوئے اچانک اپنے ہی سانس سے خائف ہونے لگتا ہے اور یہی دہشت وجود کے تشخص کے لیے زادِ راہ بن جاتی ہے۔

یوں کہتے ہیں
سانس کی پھنکار سے دہشت
وہ دن تھے۔ الاماں
ننگے بدن، بپھری ہوا، جلتے کفن (کیوں کہ جدا ہوا؟ ص ۲۲)

بیگانگی کی وجودی اصطلاح بیشتر شعرا نے استعمال کی ہے۔ بیگانگی (Alienation)، فرانسیسی زبان کا لفظ ہے جسے پہلی بار ہیگل نے استعمال کیا اور عارضی ارتقائے ذہن کے عمل کی ایک ذیلی کیفیت قرار دیا۔ اس کے علاوہ مارکس نے اسے بیگانگیِ محنت (Estranged Alienation) اور

فیورباخ نے اسے بیگانگیِ مذہب (Religious Alienation) کے طور پر استعمال کیا ہے۔

انیس ناگی کے نزدیک یہ ایک احساس ہے جو انتہائی پریشان کن کیفیت اور فرد کی زندگی میں انقلاب کا ذمہ دار ہے۔ اس کا محرک خارجی یا داخلی محرک ہوسکتا ہے۔

وقت کے دوزخ میں ہم جلتے رہے
بیگانگی کے دن کٹے اور رات بھی
بیگانگی ایک دائرہ ہے آگ کا
جس کے اندر ذات کا ہے آئنہ،
کچھ فاصلے پر لوگ ہیں
نامہرباں، ناآشنا (ایک اجنبی کی طرح، ص ۶۵۷)

نیستی، وجودیت میں مستعمل امکانی اصطلاح ہے اور دہشت کی ہی ایک کیفیت ہے۔ وجودی فلسفے میں اس کا مطلب یہ ہے کہ دہشت میں وجود نیستی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ ہے جب فرد اپنے آپ کو فنا کے قریب خیال کرتا ہے۔ 'نیستی' کا استعمال، انیس ناگی کے ہاں ایک نظم بعنوان 'نیستی کی ایک نظم' میں یوں ہوا ہے۔

سمجھ میں بات آتی نہیں
دنیا بنائی کس لیے؟
یہ بدمزہ کتنا سفر ٹھہرا،
جوانی، بڑھاپا موت آخری منزل سب کی___ (نیستی کی ایک نظم، ص ۵۲)

Nausea، کراہت، متلی، عمومی طور پر مستعمل وجودی اصطلاح ہے۔ جسے سارتر نے استعمال کیا ہے اور سارتر کا ناول بھی اسی نام سے ہے جس کا مرکزی کردار 'راکن ٹائن' اس کیفیت کا شکار ہے، سارتر کے نزدیک اس کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ اس سے فرد، اپنے آپ سے اور دنیا سے کرب کی شدت کی تشفی کرتا ہے۔

جب کہ انیس انگی نے اسے متلی کے معنوں میں استعمال کیا ہے، اُن کے خیال میں فرد کی ذات، اپنے وجود اور دنیا کے مہمل پن کی مشترکہ مظہر ہے۔ خارجیت اور داخلیت کا امتزاج ہے، اُن کے نزدیک یہ امکانی پہلو ہے اس سے اپنے وجود اور معروض کی موجودگی کا احساس جنم لیتا ہے۔

ہمارے باطن کی ایک متلی سے
شہر سارا بگڑ گیا ہے
جدھر ہی دیکھو
تاجرانہ سی سنگدلی نے
سلوک مہر و وفا کو ہم سے اُچک لیا ہے (متلی، ص ۳۴۸)

وجودیت میں حریت کی اصطلاح کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ کرکیگارڈ کے نزدیک،

حریت یا آزادئ کرب، اضطراب اور ہیجان کی جدلی صورت ہے۔

ہائیڈیگر کے خیال میں انسان کے وجود کی یک جہتی، آزادی کی بنا پر ہی ممکن ہے اور موت اور وابستگی، آزادی کی طرف پہلا قدم ہیں۔ جبکہ سارتر فرد کے وجود کے جداگانہ تشخص کے قیام کا خواہاں ہے۔ سارتر کے ڈرامے "Flies" کا مرکزی کردار اس کی عمدہ مثال ہے۔ انیس ناگی کے خیال میں آزادی حقیقتاً فرد کے ہر عمل ہر حرکت کی عکاس ہے جو وہ معاشرے میں رہتے ہوئے سرانجام دیتا ہے، مگر آزادی کا شعوری مفہوم خوف، دہشت، تنہائی، مایوسی، بے خوابی کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔

سوچ کا زخمی پرندہ
ایشیا کے سارے ملکوں سے گزر کر آگے بڑھتا جا رہا ہے
ایک ایسے آسماں کی سمت
جو تاریخ سے آزاد ہے
جغرافیے کی قید سے آزاد ہے
جذبات کی شوریدگی سے دُور ہے
ایک ایسا سماں۔۔۔۔
جو گماں کے نور سے بھرپور ہے (سوچ بھی کچھ سوچتی ہے، ص ۶۶۸، ۶۶۹)

وابستگی کی کسوٹی، انتخاب ہے۔ یہ اصطلاح کرکیگارڈ کے ہاں بھی ملتی ہے۔ انیس ناگی کے نزدیک، وابستگی، مایوسی، دُکھ، حزن سے نجات کا ذریعہ ہے۔

یہ ہماری تدبیر بھی تھی اور قسمت کی تجویز بھی کہ مظاہر کے درمیان، انسانی
خصلت کے پیچ وخم کے درمیان اور زندگی کی کثرت کے درمیان ذرے کی مانند پیہم
مضطرب رہیں،
کسی ایک مقام پر سکون نہ کریں، کسی ایک خواہش پر توقف نہ کریں، کسی
ایک چہرے سے وابستگی کا وعدہ نہ کریں،
کہ تمام موجودات حرکت کے وظیفہ میں ہیں۔ تمام تغیر کے سانچے میں نیم
جاں ہیں، (نوحہ ۱۶، ص ۱۷۱)

خوف کا تصور، وجودیت میں اہمیت رکھتا ہے۔ وجودی فلسفیوں کے مطابق خوف، فرد کی اُس کیفیت کا اظہار ہے جو ماورائے وجود ہونے کی بنا پر، فرد پر وارد ہوتی ہے۔

انیس ناگی کے نزدیک خوف کا درست مفہوم، کائنات کی بے ثباتی اور فنا کا پردہ چاک کرنے میں ہے، ایسی صورت فرد کو اپنی روح کی بالیدگی میں مکمل طور پر جذب کر کے انسان کی باطنی دنیا کو وسعت بخشتی ہے۔

کبھی رات کا خوف ہے

کبھی ذات کا خوف ہے
کبھی موت کا خوف
کبھی خوف کا خوف ہے
ہمارے لیے بس یہی زندگی ہے (ایک نظم خوف کی، ص ۴۶۱)

تصورِ موت، وجودیت کے فلسفہ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ہائیڈیگر کے مطابق موت، پیدائش کا معکوسی روپ ہے۔ جبکہ انیس ناگی کے نزدیک موت، زندگی کے تعاقب میں ہے اور امکانی صورت میں ہر وقت انسان کے وجود میں موجود ہے، یہ ہیئتی وجود پر دہشت کی صورت نمودار ہوتی ہے۔ انسان کی ارادی اور اختیاری صورتیں اُس کے نجات میں بے معنی ہیں بلکہ یہ انسان کی ارادی اور اختیاری کوششوں کو یک جہتی اور استحکام کی اکائی میں تشکیل دیتی ہے۔

بے خیالی میں زندگی گزرتی جا رہی ہے
زندگی جو موت کے آسیب میں ہے
ہر کوئی حالات کے زنداں میں ایک دوسرے کو گھورتا ہے
رات تاروں کی طرح وہ جاگتا ہے،
کچھ بتانے سے مگر لاچار ہے۔
بیدار ہو یا خواب میں
احساس کے ہر زخم سے آزاد ہے۔
وہ بے خیالی میں گزرتی زندگی سے مطمئن ہے
جو مسلسل موت ہے
اس موت میں وہ جی رہا ہے (بے خیالی میں، ص ۴۴۵)

وجودی فلسفہ میں، بے خوابی کی کیفیت میں فرد میں دہشت، تنہائی اور زمان و مکاں سے ماورائیت کے پہلو اُجاگر ہوتے ہیں۔ انیس ناگی کے نزدیک بے خوابی کا جنم معاشرتی نارسائی اور رویوں کی ہرجائیت ہے اور بے خوابی بھی وجود کے اثباتی ادراک اور تسخیرِ فطرت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

یہ بے خواب راتوں کی بنجر زمیں
دور تک تیرگی ہے
تلمساں کی سُرخ مَے سے
مرے دونوں رُخسار جلنے لگے ہیں
تنفس میں شوریدگی ہے
کہ شاید عروسی کی بے خواب راتوں کا دَر کھل گیا ہے (بے خوابی کا خواب، ص ۳۰۲)

تنہائی کی اصطلاح کو انیس ناگی نے اپنی دو تہائی نظموں میں جگہ دی ہے اور اس کا ابلاغ معنیاتی سطح پر متنوع انداز میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انیس ناگی کے نزدیک تنہائی فرد کے وجود کی واقعاتی حیات کا ادراک ہے۔ فرد مختلف صورت حالات سے دوچار ہو کر یا کسی داخلی یا خارجی محرک کے زیرِ اثر اس کا انتخاب کرتا ہے یا پھر خود ہی اس کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

بحر و بر کی صعوبتوں، فاقہ کشی اور تنہائی کے جہنم میں
رہتے ہوئے
ایک نیا عالمِ واردات خلق کرنے والے ہیں   (نوحہ ۱۱، ص ۱۶۲)

مزید

تنہائی کا بوجھ اُٹھانے میں اک لذت ہے
تنہائی بھی کیسی عادت ہے
جب کوئی آ جاتا ہے
تو یہ آئینہ چپ چاپ شکستہ ہو جاتا ہے
دوسرا اپنے آپ کو نافذ کرتا ہے   (لذت، ص ۶۴۷)

انیس ناگی کے ہاں وجودی اصطلاحات کا استعمال اشعار کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں اور نظموں کے زیرِ عنوان بھی ہوا ہے۔ جو اُن کے وجودیت کے تخلیقی دائرہ کو تکمیل کی صورت عیاں کرتا ہے۔ اُن کتابوں کے عنوانات میں 'بے خوابی کی نظمیں' ۱۹۸۷ء، 'بے خیالی میں' ۱۹۹۲ء، 'درخت مرے وجود کا' ۱۹۹۷ء، بیگانگی کی نظمیں، ۲۰۰۰ شامل ہیں۔

وجودی اصطلاحوں کے زیرِ عنوان لکھی گئی نظمیں مندرجہ ذیل ہیں: 'موت'، 'ہمارا وجود ایک علامت'، 'وجود'، 'ایک بکھرا ہوا ذہن'، 'بے خوابی کی تمثیل'، 'بے خواب رات'، 'بے خوابی کا خواب'، 'خوف'، 'موت ایک دروازہ'، 'بے خوابی کا لمحہ'، 'متلی'، 'بیابانی کا دن'، 'تنہائی'، 'اک نظم خوف کی'، 'بے خیالی میں ایک حادثہ'، 'ایک بے چین رات'، 'بیگانگی'، 'نیستی کی ایک نظم'، 'تنہائی سے دوستی'، 'آوارگی'، 'ایک اجنبی کی طرح'، 'پژمردگی کی ایک نظم'۔

وجودی اصطلاحات کی بازگشت انیس ناگی کے کلیات 'بیگانگی کی نظمیں' کے ورق ورق پھیلی ہوئی ہے جو کہ اُن کی شاعری پر وجودیت کے عملی اطلاق کا بین اظہار ہے کیوں کہ کسی اصطلاح کا جنم اور اُس کا اطلاق کسی نظریے کے ببانگِ دہل احیاء و اقرار کے مماثل ہے۔

وجودیت کے وقتی اضمحلال کے باوجود، انیس ناگی کی شاعری میں وجودی اصطلاحات کے عملی نمونے، اپنے شباب کی بہار دکھاتے رہیں گے۔

☆☆☆

صفدر سلیم سیال

کچھ اپنے لب و لہجہ کو تبدیل وہ کرتا
پھر ہم سے بیاں رنج کی تفصیل وہ کرتا

یک طرفہ مراسم تو نبھائے نہیں جاتے
کچھ اپنے فرائض کی بھی تکمیل وہ کرتا

ہم اُس کے لئے تختِ سلیماں سے اترتے
گر اپنے ارادے ہمیں ترسیل وہ کرتا

کچھ مدِّ نظر وہ بھی تو رکھتا مری مشکل
کچھ اپنی شرائط میں ذرا ڈھیل وہ کرتا

کچھ ہم بھی موخّر اُسے کرتے نہ سفر میں
تھوڑی سی اگر لطف میں تعجیل وہ کرتا

تفہیم تعلق میں یہ تاخیر نہ ہوتی
کچھ خواب اگر خوابوں سے تبدیل وہ کرتا

کچھ ہم بھی اگر عشق میں بدنام نہ ہوتے
اس طرح نہ طے یوں کبھی تفصیل وہ کرتا

الزام لگاتا وہ بڑے شوق سے لیکن
کچھ اپنے کئے عہد کی تکمیل وہ کرتا

وہ یونہی نکلتا کبھی سڑکوں پہ سرِ شام
کچھ آب و ہوا شہر کی تبدیل وہ کرتا

آدابِ ملاقات سلیم اُس کو سکھاتے
گر رمزِ ملاقات کی تحصیل وہ کرتا

☆☆☆

صفدر سلیم سیال

اپنی سانسیں مری سانسوں میں ملا کے رونا
جب بھی رونا مجھے سینے سے لگا کے رونا

قیدِ تنہائی سے نکلا ہوں ابھی جانِ طلب
مجھ سے ملنا مجھے زلفوں میں چھپا کے رونا

ہم نے ایسی بھی گزاری ہیں بہت سی راتیں
دل کے خوش رکھنے کو افسانے سنا کے رونا

اتنا سفاک نہ تھا گھر کا یہ منظر پہلے
تری یادوں کے چراغوں کو بجھا کے رونا

اس سے پہلے تو وہ اتنا کبھی حسّاس نہ تھا
مجھ پہ بے مہری کا الزام لگا کے رونا

زود رنجی میں بھلا دیتا ہے سارے رشتے
خوب یہ طرزِ وفا ہے کہ بھلا کے رونا

اِس قدر ربط غنیمت ہے سرِ دست سلیم
میری تصویر کو البم میں سجا کے رونا

صفدر سلیم سیال

دل و دماغ سے نیشِ شرر گزرتا ہے   تمام وقت مرا پُر خطر گزرتا ہے
میں بند رکھتا ہوں سب دل کی کھڑکیاں لیکن   کوئی پرندہ ہے بے بال و پر گزرتا ہے
مغالطے میں ستارے اُترنے لگتے ہیں   وہ جب گلی سے کبھی ننگے سر گزرتا ہے
فتور کس کا ہے کچھ اس پہ سوچنا ہوگا   جو غیر بن کے کبھی نامہ بر گزرتا ہے
اُسی کی دُھن میں شبِ انتظار کاٹتا ہوں   کوئی تو ہے جو بوقتِ سحر گزرتا ہے
نڈھال ہو کے اگر گھر میں بیٹھنا چاہوں   تو سر سے اک نیا خبطِ سفر گزرتا ہے
بہت کٹھن ہے بھرم رکھنا آدمیّت کا   کئی عذابوں سے ظرفِ بشر گزرتا ہے
یہ اور بات کہ دل مطمئن نہیں ہوتا   وگرنہ دن تو بصد کرّوفر گزرتا ہے
ترے بغیر وہی وقت کاٹنا مشکل   جو تیرے ساتھ بہت مختصر گزرتا ہے
نوید ہے تمھیں وابستگانِ صبحِ جمال   بہت قریب سے نجمِ سحر گزرتا ہے
پسند آتی نہیں اب نزاکتیں اُس کی   کس اہتمام سے وہ بازی گر گزرتا ہے
امیرِ شہر سے جس طرح جنگ کی میں نے   انھی خطوط پہ لختِ جگر گزرتا ہے
خود اپنے عہد سے ہٹ کر کبھی نہ شعر کہو   کلام ایسا سدا بے اثر گزرتا ہے

خود اپنے قد کو حقارت سے دیکھتا ہے سلیم
قدومِ کوہ سے جب بھی شُتر گزرتا ہے

☆☆☆

صفدر سلیم سیال

کچھ اس طرح تری خوشبو کو زیب تن کرتے   تمام عمر تجھے اپنا پیرہن کرتے
سوار سر پہ ہوئے ہیں علائقِ دنیا   وگرنہ دیدہ و دل کو ترا وطن کرتے
لرزتے ہم تری پلکوں پہ آنسوؤں کی طرح   قیام یوں ترے دل میں مرے سجن کرتے
خرام بھی کبھی کرتا تُو چاند راتوں میں   تو نقل تیری شگوفے چمن چمن کرتے
طواف کرتے تری رُوح کی گھپاؤں میں   ہم اس طرح تروتازہ ترا بدن کرتے
سدا دیا اُسے الزام بے وفائی کا   درست تم بھی کبھی اپنا یہ چلن کرتے
ہمی پہ قرض نہیں تھا ترا، شبِ ہجراں   کبھی تو وہ بھی ترے دشت کو دمن کرتے
ہمارے شہر کی آب و ہوا نہیں بدلی   وگرنہ بیٹھ کے شغلِ مۂ کہن کرتے
ہر ایک غم سے بچاتی رہیں تری یادیں   تمھیں بھُلا کے کہاں زندگی کٹھن کرتے
اُس ایک لطف کی مہلت نہیں ملی اب کے   وگرنہ دُور ترے جسم کی تھکن کرتے
سمندروں سے بھی بڑھ کر عمیق ہے وہ شخص   مری تو عمر کٹی اس کو ہم سخن کرتے

وہ معتبر تو نہیں تھا یہ جانتے تھے سلیم
خلاف اس کے مگر کیسے سوئے ظن کرتے

☆☆☆

صفدر سلیم سیال

قصور اس میں کوئی اہلِ نظر میرا نہیں تھا
مری دستار تھی لیکن وہ سر میرا نہیں تھا

تشدد کر چکے تو یہ نتیجہ سامنے آیا
ملے ہتھیار جس گھر سے وہ گھر میرا نہیں تھا

میں اُس کے لطف بے جا سے ہوا مشہور شہروں میں
مگر اُس پر کبھی اتنا اثر میرا نہیں تھا

غلط فہمی یہی ہے آج تک میرے رقیبوں میں
وہ مجھ پر جان دیتا ہے مگر میرا نہیں تھا

جو دعوے کر رہا ہے آج میری ہم رکابی کے
یقیں جانو کبھی وہ ہم سفر میرا نہیں تھا

مجھے نیندیں نہ جانے کس نگر میں چھوڑ جاتی ہیں
میں سو کر جب بھی اُٹھا ہوں وہ گھر میرا نہیں تھا

مجھے جُرم ضعیفی کی سزا ملتی رہی ہے
لگایا جو شجر میں نے ثمر میرا نہیں تھا

صفدر سلیم سیال

ایسا ملاوٹوں کا پڑا قہر ان دنوں
خالص کہیں سے ملتا نہیں زہر ان دنوں

ہم اُس کی دست بُرد سے کیسے بچیں گے آج
اُس کی گرفت میں ہے بھرا دہر ان دنوں

اک دوڑ سی لگی ہے زر و مال کے لیے
جس کی لپیٹ میں ہیں بر و بحر ان دنوں

آنے لگا ہے آج ہر اک مہتمم سے خوف
بے آب چل رہی ہے ہر اک نہر ان دنوں

اس قہرِ بے کراں کا کوئی سدِّ باب ہو
گاؤں کو کھا رہے ہیں بڑے شہر ان دنوں

اپنے خلوص پر بھی نہیں اب کے اعتماد
ایسی منافقت کی چلی لہر ان دنوں

آؤ کہ اُس کو جا کے ذرا دیکھ لیں سلیم
پاگل ہوا ہے جس کو لیے شہر اِن دنوں

☆☆☆

صفدر سلیم سیال

ہیں فکر مند سارے دکاندار کچھ کہو
بے جان ہو گئے ہیں خریدار کچھ کہو

کب سے صبا نے کوئی سندیسہ نہیں دیا
اے مُطربانِ کوچۂ دلدار کچھ کہو

اس دورِ حرص و آز میں کس کس کا نام لُوں
خاموش ہو گئے ہیں سبھی یار کچھ کہو

مایوس ہو چلی ہیں غزالوں کی ٹولیاں
اے عاشقانِ رنگِ رُخِ یار کچھ کہو

شاید ہمارا فیصلہ کچھ رنگ لا سکے
ہم جا رہے ہیں آج سُوئے دار کچھ کہو

مفلوج ہو چکے ہیں سبھی صارفین شہر
حیرت زدہ ہیں شہر کے بازار کچھ کہو

کس سوچ میں پڑے ہیں مریدوں کے قافلے
اے وارثانِ طرۂ دربار کچھ کہو

ٹھہرا ہوا ہے یوسفِ بے کارواں کہاں
سُونا پڑا ہے مصر کا بازار کچھ کہو

اک ضربِ بے اماں کی ضرورت ہے ان دنوں
اے کشتگانِ پشت بہ دیوار کچھ کہو

مجنوں سے کہہ رہے ہیں غزالانِ دشتِ شوق
خطرے میں پڑ گیا ہے ترا پیار کچھ کہو

صفدر سلیم سیال

یوں تو یکجا تھے مگر بُوئے رفاقت کم تھی
ہمیں اک دوسرے سے جیسے محبت کم تھی

دونوں اس بات پہ حیراں تھے دمِ شام فراق
اب کے ہم بچھڑے تو جذبات میں شدت کم تھی

ناصبُوری دلِ بے مہر دکھائی تُو نے
مہ رُخوں میں کیا کسی سے تری قیمت کم تھی

تُو نے کس واسطے یہ شہرِ نگاراں چھوڑا
کیا سرِ شہرِ نگاراں تری عزت کم تھی

خواہشیں باعثِ آلام ہوا کرتی ہیں
جو بھی مایوس ہوئے اُن میں قناعت کم تھی

کچھ نہیں ترکِ مراسم کا جواز اس کے سوا
ہمیں اک دوسرے کی اب کے ضرورت کم تھی

وہ مرے پاس صفائی کے لیے آیا تھا
باتیں کرتا تھا بہت اُن میں وضاحت کم تھی

جانے کس عرصۂ حالات سے وہ گزرا ہے
آج اُس شخص کی باتوں میں رعونت کم تھی

ہمیں بوسوں کی ضرورت تھی مگر اب کے سلیم
اُس کے بوسوں میں وہ پہلی سی حلاوت کم تھی

یوں تو بے ساختہ وہ ہم سے ملا تھا لیکن
اُس کی آغوش میں اس بار حرارت کم تھی

صفدر سلیم سیال

اب کے خوشبو سے گل و گلزار خالی ہو گئے
انقلاب آیا مگر کردار خالی ہو گئے

جن کے دیکھے سے دمک اُٹھتی تھیں دل کی بتیاں
ایسے چہروں سے در و دیوار خالی ہو گئے

کون سی منزل پہ لایا ہے مجھے ذوقِ طلب
سب پسندیدہ مرے معیار خالی ہو گئے

ڈوبتے سورج نے یہ منظر بھی دیکھا دوستو
شام سے پہلے بھرے بازار خالی ہو گئے

کون سے گوشے میں دل کا بوجھ ہلکا ہم کریں
دل ربائی سے سبھی تہوار خالی ہو گئے

کس کے آگے بے بسی کا ماجرا جا کر کہیں
درد مندی سے ہمارے یار خالی ہو گئے

مٹ گئی جس دور میں مظلوم و ظالم کی تمیز
حکمرانی سے وہی دربار خالی ہو گئے

صفدر سلیم سیال

مقتل سے یا ملتی ہے سرِ دار کسی کو
خیرات میں ملتی نہیں دستار کسی کو

کیا اِس کی ضمانت ہے کہ دل جیت لیے جائیں
مغلوب تو کر سکتی ہے تلوار کسی کو

تاریخ اُنہیں دیکھئے کیا دیتی ہے انعام
شہرت تو دلا سکتے ہیں اخبار کسی کو

اک ذوقِ سفر شرطِ سفر ہے پئے امکاں
کب روک سکی ہے بھلا دیوار کسی کو

یہ آگ کا دریا ہے خود ہی تیرنا ہوگا
کوئی بھی نہ لے جائے گا اُس پار کسی کو

☆☆☆

اخلاق انصاری/ننگر چنا

''پیاس ہی پیاس''

قہقہہ نہیں بلکہ اگنی بان تھا جو میرے دل کے کروک شیتر میں جا گرا تھا۔ اُس نے پتے دکھاتے ہوئے کہا، ''دروپدی کو بھی تو جوا میں ہارا گیا تھا نا؟'' اُس نے بورڈ پر رکھے پتے اٹھائے اور گلاس کو ایک ہی گھونٹ میں ختم کرلیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''رو رہے ہو؟''

''نہیں۔۔۔''

''نہیں، کیسے؟''

''رو رہے ہو، نشہ ہو گیا ہے تمہیں؟''

''نہیں''

''اُٹھو۔'' اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ میں بیٹھا رہا۔

''اُٹھو۔۔۔''

میں اُٹھا۔ ہم بنگلے سے نکل کر سڑک پر آ گئے۔ وہ کہنے لگا: ''دیکھو! یہ تمام عالم لافانی ہے۔ یہاں ہر چیز لافانی ہے۔ فنا کرنا صرف ایشور ہی جانتا ہے۔ دُکھ، سُکھ کو فنا کرے گا۔ تم اور میں، فنا ہو جائیں گے، لیکن یہ دنیا یونہی چلتی رہے گی۔''

''پان۔۔''

''ہاں۔ پان کھاتے ہیں۔''

وہ سڑک کے چوراہے سے کیبن کی طرف مڑتے ہوئے کچھ لمحے وہاں کھڑا رہا پھر چرچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا: ''دیکھو، ٹیوب لائٹ کی روشنی میں وہ جو کھڑکی سے صلیب نظر آ رہی ہے، وہ آج یوں لگتا ہے جیسے لڑکی بانہیں پھیلائے کھڑی ہو۔''

''چھوڑو۔۔۔ پان کو۔'' میں نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا، ''بس۔''

''نہیں، کیوں؟''

''یار! میں گھر جاؤں گا۔''

اُس نے مجھے بُجّا دیا اور خود کھوکھے کی طرف چلا گیا۔ واپس آیا تو میں نے کہا، ''ہیرا کی شادی ہو جائے۔ کل بڈھے نے کہا، تجھے فرصت بھی ہوگی یا نہیں۔۔۔ کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اس کا کہیں بندوبست کرو۔۔۔''

''آج کل کا ماحول دیکھ رہے ہو نا۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔۔۔''

''آؤ۔'' اُس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

''پرکاش! تجھے تو پتہ ہے کہ میں بتوں کو اپنی انگلیوں پہ نچاتا ہوں اور قسمت تمہارا ساتھ دیتی ہے۔''

منصور بھی عجیب طبیعت کا آدمی ہے۔ وہ قہقہے مارتے ہوئے اپنے دُکھ بھی ہنس ہنس کر سنا دیتا ہے۔ حالات کے آگے بے بس نہیں ہوتا___ کبھی کبھار تو پہاڑ ایسا لگتا ہے۔

ہم دونوں سڑک چھوڑ کر دریا کے کنارے بیٹھ گئے، جہاں اکثر آتے اور گھنٹوں بحث مباحثہ کیا کرتے ہیں۔

''بولو۔۔۔''

''کیا بولوں؟''

''ہمیشہ کون سی بکواس کیا کرتے ہو؟''

میں خاموش۔

''دیکھو، پُل کے دروازوں پر کتنے بلب جل رہے ہیں؟''

''بتاؤ؟''

میں خاموش۔

''ایک، دو، تین، چار، پانچ۔۔۔ دوسرے بلب نہیں جل رہے ہیں۔''

''بس کرو منصور! مجھے پانچ کا عدد بالکل پسند نہیں۔ اسی عدد پر میری زندگی میں بہت سارے حادثے ہوئے ہیں۔''

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا ''یہاں، اس جگہ۔۔۔ جہاں ہم بیٹھے ہوئے ہیں کسی زمانے میں ایک بہت بڑا گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ بیوپاری یہاں سے کشتیوں میں تربوز بھر کر ملکوں ملکوں تجارت کرتے تھے۔ اب ان دو پُلوں کے درمیان صرف تم، میں اور پٹڑی کی آواز ہے۔''

میں خاموش۔

پھر کہنے لگا ''چندر کی سناؤ؟''

''ٹھیک ہے۔''

''پڑھائی میں محنت کرتا ہے۔''

''ہیرا سے ہوشیار ہے۔ میں نے اسے ٹیوشن پڑھنے بٹھا دیا ہے۔ لیکن کہتا ہے کہ میں ڈاکٹر بنوں گا۔ ڈاکٹر اور وہ بھی حیوانات کا۔ اسے بچپن سے ہی پرندے اور جانور پالنے کا شوق ہے۔ اس سے آج بھی پوچھو گے تو کبوتر سے لے کر مرغے تک، مچھلیوں سے لے کر مگرمچھ تک، ان کی اقسام اور امراض،

ان کی عادتیں اور علاج پر آرام سے بولتا جائے گا، لیکن۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ وہ انجینئر بنے، پُل بنائے۔ ان پُلوں سے بھی زیادہ خوبصورت۔''

اُس نے مجھے درمیان میں ٹوکتے ہوئے چیخ کر کہا،

''ہاں وہ پُل دنیا کا عظیم ترین پُل ہوگا۔ لوگ اسے دیکھنے آئیں گے۔ پھر ریڈیو، ٹی وی اور اخباروں میں انجینئر چندر کے انٹرویو ہوں گے۔ ایسے ہوگا نا؟''

''لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟؟''

''لیکن، یار! میں ہیرا کی۔۔۔''

''چھوڑو۔۔۔ چھوڑو، سب کچھ اپنے وقت آنے پر ہوتا ہے اور سب کچھ صحیح ہوگا۔۔۔ ایسے ہی ہوتا ہے، جو بھی ہونا ہوتا ہے۔ تمہیں تو پتہ ہے کہ بچپن میں ہی یتیم ہو گیا۔۔۔ باپ نہ ماں۔ یہاں تک کہ میرے بڑے بھائی نے مجھے اپنے ہوٹل پہ بیرا گری پر کھڑا کر دیا۔ وہاں پر ہی دو وقت کی روٹی ملتی تھی۔ میں نے راتیں بینچوں پر گذاریں۔۔۔ میرے بھائی نے شیشے کا گلاس توڑنے پر مجھے تھپڑ مارا تو میں کراچی بھاگ گیا۔ اس لیے آج بھی شیشے کے گلاس میری کمزوری ہیں۔۔۔ مزدوری کی، پٹرول پمپ پر کام کر کے میٹرک کا امتحان دیا تو ٹیچری ملی، وہاں پر ہی تمہاری بھابھی استانی تھی، اس سے شادی کی۔'' وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔

سامنے دریا میں ایک کشتی تیرتی جا رہی تھی۔ لالٹین کی ہلکی روشنی بادبان پر پڑ رہی تھی اور کشتی میں کوئی گا رہا تھا۔

منصور کچھ وقت خاموش رہا پھر کہنے لگا ''زندگی یہی ہے۔۔۔ یہ کشتی پورا گھر ہے۔ باورچی خانہ، غسل خانہ___ اور اسی میں سونا اور کھانا۔'' پھر کہنے لگا ''چھ بچے، ان کی تعلیم، شادی غمی، ایک کمرے پر مشتمل گھر، گزر بسر بہت مشکل۔۔۔ موم بتیاں بنا کر فروخت کیں۔۔۔ خاکی لفافے بنا کر بیچے۔۔۔ تنور پر روٹی کے پیڑے بنا بنا کر پرائیویٹ ایم۔ اے کیا۔۔۔ پھر انٹرویو۔ اب نوکری ہے، گاڑی ہے۔۔۔ بچے پڑھتے ہیں۔ جمیل کراٹے بھی سیکھا تو گٹار بھی بجاتا ہے۔ باقی جو بچوں نے کرنا ہوگا، وہی ہوگا۔ اب چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔ دعا کرو، دعاؤں سے ہیرا کا بھی بھلا ہو جائے گا۔۔۔

یار! تم نے سارا مزہ ہی غارت کر دیا۔''

قریب ہی چرچ کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔

''چلیں۔۔۔''

''اُٹھو۔۔۔''

چوراہے کی اکثر دوکانیں بند ہو گئی تھیں۔

ہم پیدل چلتے چلتے منصور کے گھر تک آ گئے۔ اُس نے گاڑی نکالی تو اس کے بیٹے نے پوچھا، ’’بابا!۔۔۔کہاں؟‘‘

’’بیٹے! تمہارے چچا کو چھوڑ کر آتا ہوں۔‘‘

وہ گاڑی میں بیٹھا، چابی گھما کر کلچ پہ پاؤں رکھا اور گیئر تبدیل کر کے آہستہ آہستہ ڈرائیو کرنے لگا۔ اُس نے ایک جگہ بریک پہ پاؤں رکھا اور کہا، ’’یار! کچھ تو بول۔ مجھ سے تو تمہیں کوئی دُکھ نہیں پہنچا نا؟‘‘

’’نہیں۔۔۔نہیں۔‘‘ میں مسکرا دیا۔

وہ مجھے مین روڈ پر چھوڑ کر چلا گیا۔ میں تنگ گلیاں لتاڑتے، گھر کی طرف بڑھتے ہوئے سوچ رہا ہوں۔۔۔ ’’ہیرا کے لیے رشتہ آیا تھا۔۔۔ بڈھے نے کتنا کہا۔۔۔ لیکن کیا کریں؟ لڑکا پڑھا لکھا بیروزگار۔۔۔ لیکن بیروزگار کیسے؟ نوکری جو نہیں تھی۔۔۔ لیکن باپ کے ساتھ دھندے میں جو ہاتھ بٹا رہا ہے۔۔۔ صرف چندر کی ماں کی ضد۔۔۔ چھوڑو اسے۔۔۔ اب جونہی کوئی اچھا رشتہ آیا تو۔۔۔‘‘

میں نے ٹائم دیکھا، ’’ڈیڑھ‘‘۔ سب سو گئے ہوں گے۔ چندر جاگ رہا ہوگا۔۔۔ پڑھ رہا ہوگا۔ میں نے کنڈی کھڑکائی تو بڈھے نے کھانستے ہوئے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا تو چندر کو دیکھا، چندر کی ماں رو رہی تھی۔ میں نے اس سے طنزیہ لہجے میں پوچھا، ’’کیا ہوا؟‘‘

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دے، بڈھے نے ہلکا سا طنزیہ قہقہہ لگایا۔ قہقہہ نہیں بلکہ اگنی بان تھا جو میرے دل کے کروک شیتر میں جا گرا۔

میرے تن بدن کو آگ تب لگی، جب بڈھے نے کھانستے ہوئے کہا، ’’پولیس چندر کو جوا کے اَڈے سے گرفتار کر کے لے گئی۔‘‘

کچھ دُور ہیرا رو رہی تھی۔ میں نے جیب سے ٹشو پیپر نکالا، ناک صاف کی اور بڈھے کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے غصے سے گھور رہا تھا۔ میں نے ناک صاف کر کے ٹشو پیپر پھینکا تو یوں لگا جیسے ٹشو کے ساتھ ناک بھی نیچے جا گری ہو!!

☆☆☆

لیاقت علی

ٹیکسی اسٹینڈ

(۸؍اکتوبر کے تناظر میں)

ہر صبح وہ گھنٹہ بھر پالش کرنے اور رگڑ رگڑ کر چمکانے کے بعد بھی جب یہ 78 ماڈل کی پرانی ٹیکسی لے کر دارالحکومت کی شفاف شیشے ایسی چمکتی شاہراؤں پر نکلتا تو آس پاس سے گزرنے والے نظر بھر کریوں دیکھتے گویا وہ اُسے اس کمال پر داد دے رہے ہوں۔ گزشتہ دو برس سے فری اکانوی اور بینکوں کے آسان شرائط پر ملنے والے وافر قرضوں نے جہاں دیگر تجارتی منڈیوں میں ہلچل پیدا کی وہیں بعض بڑے بڑے انوسٹرز کو بھی انہی ٹیکسی اسٹینڈز میں لا بٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے نت نئے ماڈلز کی آنکھوں کو خیرہ کرتی گاڑیاں اس اسٹینڈ میں بھی آن کھڑی ہوئیں کہ جہاں اب اُس کی اس پرانے ماڈل کی گاڑی کی طرف کسی سواری کا بڑھنا ایسا ہی تھا جیسے دارالامان میں ڈھلتی عمر کی لڑکی کا کوئی معقول رشتہ آ جائے۔ اپنی اس کمزوری کے ازالے کے طور پر وہ نہ صرف یہ کہ ہر صبح اسے چمکانے میں گھنٹہ بھر صرف کرتا بلکہ دیگر نئی گاڑیوں کے مقابلے میں کرایہ بھی قدرے کم وصول کرتا تا کہ اُس کی گاڑی کے یہ پہیے گھومتے رہیں کہ جن کے گھومتے رہنے پر ہی اُس کے چار بچوں، بیوی اور گھر گرہستی کا پہیہ بھی گھومنے والا تھا۔ مگر اس سفری رعایت کی سہولت اُس وقت تک کیونکر بتائی جا سکتی تھی کہ جب تک کوئی آ کر پوچھ نہ لے کہ ’’بھیا چلو گے؟‘‘

اس رعایت کی خوشخبری بھی اسی نے ایک سفید چارٹ پر جلی حروف میں لکھوا کر گاڑی کی ونڈ سکرین پر نصب کر رکھی تھی مگر آس پاس کھڑی نئی نویلی گاڑیاں تو جیسے سواری کی توجہ ایک لمحے کو بھی بٹنے نہ دیتیں اور وہ جھٹ سے انہی کی طرف لپکتے، دیکھتے ہی دیکھتے سیلف لگتے اور وہ دھول اُڑاتے پہیوں کو اُس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک کہ وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گھنٹوں سیٹ کو پیچھے لٹائے اونگھتا، اِن نت نئے ماڈلز کے پاور سٹیرنگ کو گھماتا لمبی مسافتوں کے خواب دیکھتا اور آسودگی کے سو سو منصوبے از خود اس کے ذہن میں جنم لیتے اور مر جاتے۔

دن میں دو چار چھوٹے سفر کی بھولی بھٹکی سواریوں سے گھر کا چولہا جل تو رہا تھا مگر ایک مدت سے شاید ہی کوئی اچھا کھانا اُس نے یا اُس کے بچوں نے کھایا ہو۔ سرکاری اسکول کی کم فیس کے باوجود دو بچوں کے تعلیمی اخراجات، دو چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال اور اس دو کمرے کے مکان کے ماہانہ کرایے کو یہ دو چار سواریاں تھوڑا ہی پورا کر سکتی تھیں۔ اور اگر کہیں بیماری گھر کا راستہ دیکھ لیتی تو اُدھار لے کر یا کھینچ تان کر دوا دارو کا حیلہ کرنا پڑتا۔

ایسے میں بڑی اور ہر ماہ کی متعین آفت تو وہ ٹھیکہ تھا جو ٹیکسی اسٹینڈ کا ٹھیکیدار ہر کیم کو یہ حساب رکھے بغیر مانگتا کہ مہینے بھر میں اسٹینڈ سے ٹیکسی نکلی ہی کتنی بار ہے؟

اُسے اس سے کہاں غرض تھی وہ تو بس اُدھار کے ایک قاعدے سے واقف تھا کہ ایک ماہ صبر کرو، اگلے ماہ گاڑی اسٹینڈ سے نکال باہر کرو۔ آخر یہی ہوا اور وہ ٹھیکیدار کی موٹی موٹی گالیوں کو تحمل سے برداشت کرتا اب بسوں کے اڈے پر ہر آنے والی بس کے آگے پیچھے دوڑتے ان موٹر رکشوں کی قطار میں آن کھڑا ہوا کہ جو پیرودھائی سے فیض آباد فی سواری ۵ روپے لیا کرتے تھے۔ ایک دو روز تو وہ فیض آباد فیض آباد کی وہ صدا ہی نہ لگا پایا کہ جس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا اور جب چوتھے روز اُس نے ہمت کی اور یہ صدا لگائی تو اس کا گلہ رُندھ گیا اور آواز دوشاخی ہو کر یوں لڑکھڑا گئی کہ سواریوں ہی نے نہیں ان مینڈکوں کی طرح پھدّ کتے رکشے والوں نے بھی گردنیں موڑ موڑ کر اسے یوں دیکھا جیسے وہ کوئی مداری ہو مگر لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کی بے کار کوشش کر رہا ہو۔ خود اُس کی حالت بھی اُس لمحے متوسط طبقے کے اُس سفید پوش باپ کی سی تھی جو بار بار سکول سے بھاگ جانے والی نالائق اولاد پر سختی کے سبھی حربوں میں ناکام رہنے پر بالآخر اسے کسی موٹر ورکشاپ میں کام پر چھوڑ آئے اور نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کے استاد کو ہدایت دے کہ وہ صرف اس کی ہڈیوں کا دعویدار ہے کھال آپ کی ہے۔ لیکن نہیں اُس کی یہ اولاد ایسی نااہل تو نہ تھی۔ اس نے تو ایک طویل عرصے تک اُس کی کفالت کا حق ادا کیا تھا تو پھر آج وہ کیوں نمک حلالی کے حق سے انحراف چاہ رہا تھا؟ شاید نئی کمپیوٹرائج میں ہاتھ کے ہنر کے ہاتھوں مفلوج وہ دونوں اب اک دوسرے سے شرمندہ تھے۔

اس شرمندگی سے بہت دیر نگاہیں چار نہ ہو سکیں اور گھر کے اخراجات بڑھنے لگے تو اُسے ہر صورت اس ماڈل کو بدل کر کسی نئے ماڈل کے خیال نے آن گھیرا۔ مگر اس نئے ماڈل کی سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی اگر وہ قسطوں پر خریدتا تو اسے اچھی خاصی رقم درکار تھی۔ اگلے روز بالآخر وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کا کُل تخمینہ لگوانے نکلا اور ایک قسطوں پر نئی پرانی گاڑیاں بیچنے والے واقف کار ڈیلر کے ہاں جا پہنچا۔

اُس روز اُس نے گاڑی کی صفائی ستھرائی میں معمول سے کہیں زیادہ وقت لیا مگر اُس وقت تو اسے یوں لگا گویا کسی نے اُس کے کلیجے پر ہاتھ دے مارا ہو کہ جب ڈیلر کچھ دیر کی جانچ پرکھ کے بعد بولا ”کمشن کی رقم چھوڑ بھی دیں تو کل ملا کے اس گاڑی کے سوا ایک لاکھ مل سکتے ہیں۔“

”سوا لاکھ“

عجب اضطراب اور غصے سے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تو ڈیلر نے اپنی سنہری گھڑی کلائی میں گھماتے ہوئے جواب دیا:

”جناب یوں سمجھئے کہ یہ بھی خصوصی طور پر آپ کے لیے ہے کہ آپ پرانے جاننے والے ہیں، وگرنہ سچ تو یہ ہے کہ اس ماڈل کی گاڑی لاکھ سے اوپر کی نہیں۔“

وہ ڈیلر کی رفاقت کے اس احساس پر کوئی گھونٹ سا بھر کے رہ گیا۔ جی تو چاہا کہ ایک لمحے میں اس بے عزتی پر واپس پلٹ جائے مگر دماغ نے گزشتہ کئی مہینوں سے ٹال مٹول سے نہ بہلنے والے قرض مانگنے والے دوستوں اور روشن مستقبل کی اُمید بھری نگاہیں لیے بچوں کی شکلیں یک لخت اُبھار کر اُس کے سامنے لا کھڑی

کیں تو وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا:

”اور اوپر کتنے چاہییے ہوں گے ایڈوانس کے لیے؟“

ڈیلر نے ٹیبل پر دھرا اپنا نظر کا چشمہ پھر سے آنکھوں پر ٹکاتے ہوئے کچھ دیر کیلکولیٹر پر انگلیاں دوڑائیں تو انہی چند ثانیوں میں اُس کے دل میں اسی پرانی رفیق کے سستے سودے مگر نئی گاڑی پر روشن مستقبل کے طے ہوتے نجانے کتنے ہی فاصلے جھلک دکھا گئے۔ ایسے میں ڈیلر کی انگلی کھٹاک سے کیلکولیٹر پر بنے برابر کے نشان پر پڑی اور اُس نے چشمہ اُتار کر میز پر رکھتے ہوئے ”جواب دیا ایک لاکھ اور دو چار ہزار اوپر بنتے ہیں مگر آپ کے لیے پورا لاکھ!“

لاکھ!

تاسف اور بے بسی کا اِک اور گھونٹ اُس کے حلق کو چیرتا ہوا اُتر گیا اور آہستہ آہستہ کرسی سے اُٹھتے ہوئے کسی پاتال سے اس کی آواز سنائی دی۔

”جی بہت اچھا میں چلوں گا۔“

”مگر ایڈوانس دیتے جائیں تو سودا پکا سمجھئے گا۔ یہ سالی روز کی مارکیٹ ہے روز کا نیا ریٹ۔ کیا خبر جو آپ کل آئیں تو اتنے میں بات نہ بنے اور پھر اس میں میرا آپ کا اختیار کہاں۔ آپ تو خود سمجھدار ہیں نا۔“

ڈیلر نے اسے متوقع تاخیر پر پیدا ہونے والی سنگین صورتِ حال اور اس صورتِ حال میں اپنی بے بسی سے آگاہ کیا تو وہ یونہی یہ کہتا پلٹ آیا کہ ”بس ایک آدھ دن دیجیے میں بندوبست کر لوں۔“

”ہاں یہ مناسب رہے گا۔“

ڈیلر نے کہا تو سہی مگر اُس نے کہاں سنا۔

شوروم سے باہر نکلا تو اُسے اپنی اس عزیز کار کی قیمت لگوانے پر پھر سے کچھ ایسی ہی شرمندگی تھی جیسے یہ اس کی اولاد ہو کہ جسے ورکشاپ پر چھوڑنے سے پہلے اُس نے اُس کی یک مشت اُجرت کا سستا سودا طے کر کے رقم مانگ لی ہو۔ مگر یہ سب اُس کا اختیار تھوڑا ہی تھا۔ یہ سب تو وقت کا وہ بے رحم تھپیڑا تھا کہ جو مزاحمت کے سبھی حربوں کو مات دیتا فقط بے بسی سے دانت پیسنے پر مجبور کر سکتا تھا اور یہ دانت وہ بھی پیس رہا تھا۔

اگلے روز وہ پھر سے اُچھل اُچھل کر بسوں کے آگے پیچھے سواریوں کو پکارتے لپکتے رکشوں کے پیچھے اُس پھل فروش کی مانند کھڑا تھا کہ کبھی جس کی شہر کی پوش مارکیٹ میں بڑی پھلوں کی دکان ہو مگر پھر حالات اسی دوکان کو اُس ریڑھی پر لے آئیں کہ جسے لے کر وہ گلی گلی نکلے تو نت نئی صداؤں سے گھروں میں کھیلتے بچوں کو ماں باپ سے پیسے لینے اور پھل خریدنے پر اُکسائے۔ وہ بھی اب لپک کر ان سواریوں سے پوچھتا۔

”فیض آباد چلیں گے؟“

فیض آباد؟

سواریوں کی نگاہ ٹیکسی پر پڑتی تو وہ فوراً وضاحت دیتا ”کرایہ سواری کے حساب سے ہوگا“ اور اک

قدرے تذبذب کے بعد وہ اُس کی اس بات پر یقین کرتے ٹیکسی میں آن بیٹھتیں۔ آہستہ آہستہ اُس کی جھجک جاتی رہی اور سواریوں کو متوجہ کرنے کا ہنر اس کے ہاتھ آیا تو اُس کے گھر کا بجھتا ہوا چولہا پھر سے جل اُٹھا۔

مگر اب بھی نئی گاڑی میں بے نیازی سے سگریٹ کے کش لیتے لمبے روٹ کی وافر کرایوں والی سواریاں لے کر نکلنے کا خیال اُسے بے کل سا کر دیتا اور اس خواب کی جیتی جاگتی تعبیر میں حائل ایک لاکھ روپیہ کوئی سانپ بن کر اُس کے سینے پر لوٹنے لگتا۔ ایک لاکھ روپیہ۔

وہ گننے لگتا۔ پچاس ہزار کو دو سے ضرب دیتا تو کبھی دس ہزار کو دس سے۔ سو سو کے دس نوٹوں کو گنتا اور ہزار کے اس ہندسے کی سو تک گنتی گنتے گنتے اس کی سانس پھول جاتی اور وہ اس تصور کو جھٹک کر پھر سے صدائیں لگاتا۔ سواریوں کی طرف لپک جاتا۔

یہ رقم کہیں سے اُدھار لینے کا خیال بھی آیا مگر دنیا میں اس کا کوئی ایک بھی تو ایسا دوست رشتے دار نہ تھا کہ جو اُسے اتنی بڑی رقم اُدھار دے سکتا۔ چند ایک سسرالی رشتے دار یا دوست تھے بھی تو اُن کی حالت تو اس سے بھی ابتر تھی۔ اُن سے اتنی بڑی رقم مانگنا صرف اپنی شرمندگی ہی نہیں اُن کا مذاق اُڑانے ایسا بھی تھا۔ ہاں اُس کا ایک چچیرا بھائی شفیع محمد ضرور تھا جو اُن دنوں مظفر آباد میں کسی اہم سرکاری منصب پر فائز تھا اور اُس کے لیے اس رقم کا با آسانی انتظام کر سکتا تھا۔ مگر اُسے تو اب ٹھیک سے اُس کا چہرہ بھی یاد نہ تھا۔ ایک عرصہ ہوا کہ جب اُس کے چچا نے وراثت میں ملنے والے اُس کے باپ کا حصہ بھی کھایا اور مظفر آباد جا بسا۔ یہ رنجش اگرچہ مرتے دم تک اُس کے باپ کے سینے سے نہ نکلی مگر مرنے سے پہلے اُس نے اپنے بھائی سے ملنے کی خواہش ضرور ظاہر کی۔ مگر جیتے جی تو کیا موت کی اطلاع بھجوانے پر بھی اس کا چچیرا یہ چچازاد بھائی نہ آئے۔ بعد ازاں اُس کے چچا کا بھی انتقال ہو گیا۔ یہ خبر بھی اسے ایک عرصے بعد کسی جاننے والے سے ملی۔ اب صرف شفیع محمد دنیا میں اُس کا واحد ایسا رشتہ دار تھا جو اس کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ مگر شفیع محمد کے بھولے ہوئے نقوش کبھی اُسے یاد آئے بھی اور وہ کوئی سواری لیے مظفر آباد گیا بھی تو اُس کا تجسّس اُسے اُس کے گھر کے دروازے تک تو لے آیا مگر دہلیز کے اُس پار جانے کا حوصلہ وہ کبھی پیدا نہ کر سکا۔

کیوں نہ شفیع محمد سے اس دیرینہ رنجش کو ختم کرتے ہوئے یہ رقم اُدھار لے لی جائے؟

اس خیال نے آنے میں دیر نہیں کی کیونکہ ضرورت مند آدمی کا ذہن اس ضرورت کے حل کے تمام ممکنہ امکانات کی خاک ضرور چھانتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کئی راستوں کا تصور اُس کی عزتِ نفس پر ہمیشہ کے لیے بوجھ بن جائے۔ یہ خیال بھی کچھ ایسا ہی تھا جو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی تمام تر جزئیات سمیت اُس کے دماغ میں پیدا تو ہوا مگر شفیع محمد کے سامنے کر بڑھی ہوئی ہتھیلی کا یہ تصور شرمندگی اور بے عزتی کا ایسا احساس اس میں چھوڑ گیا کہ بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا ''لعنت ہو مجھ پر۔''

اب آمدنی میں ایک معقول اضافے کی نئی صورت اس نے یوں نکالی کہ سکول کے بچوں کو بھی سکول چھوڑنے اور لینے لگا۔ یوں ایک طے شدہ ماہانہ رقم اُسے ملنے لگی تو اُس کے گھر نسبتاً خوشحالی تو آ گئی مگر

نئی گاڑی کا خیال اب بھی کسی بھولے ہوئے فلمی گیت کی مانند کبھی کبھار اُس کے ذہن میں گونجتا تو مسرت کی یک لخت کتنی ہی لہریں اُس کے بدن میں پھیل جاتیں۔

ایسی ہی ایک صبح جب وہ بچوں کو سکول چھوڑ کر واپس اڈے کی طرف جا رہا تھا کہ اُسے محسوس ہوا گاڑی کچھ ببّل کر رہی ہے۔ یہ پہیوں کی الائنمنٹ تو اُس نے ابھی گزشتہ ہفتے ہی کروائی تھی تو پھر یہ ببلنگ کیسی؟

کہیں ٹائر تو پنکچر نہیں ہو گیا؟

اُس نے بریک لگائی اور کھڑکی میں سے باہر جھکتے ہوئے ٹائروں پر نگاہ دوڑائی۔

ٹائر تو ٹھیک ہیں لیکن گاڑی تو اب بھی ہلکورے کھا رہی ہے اور خو اُس کا سر بھی تو چکرا رہا ہے۔

ایسے میں اُسے باہر لوگوں کے چہروں پر عجب اضطراب دکھائی دیا تو اُسے احساس ہوا محض گاڑی ہی نہیں پوری زمین کانپ رہی ہے۔

وہ تیزی سے گاڑی سے نکلا تو اُس نے دیکھا سامنے بلند و بالا عمارتیں آہستہ آہستہ جھول رہی ہیں۔ اگلے ہی لمحے جب اُسے یہ یقین ہوا کہ یہ زلزلے کے شدید جھٹکے ہیں، زمین دوبارہ ساکت ہو گئی۔ اچانک اسے اپنے بوسیدہ مکان اور سکول گئے بچوں کا خیال آیا۔ وہ دیوانہ وار ٹریفک کے مضطرب ہجوم کو چیرتا، ہاتھ دیتی سواریوں سے بے خبر گھر پہنچا تو خدا کا شکر دونوں بچے، بیوی اور گھر سلامت تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ پلٹا اور سکول کی طرف لپکا کہ جہاں اس کے دو بچے پڑھتے تھے۔ سکول پہنچا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ عمارت سلامت تھی مگر سب بچے اور سٹاف کے لوگ انتہائی پریشانی میں باہر پلاٹ میں کھڑے تھے۔ وہ دونوں بچوں کو لیتا واپس گھر لوٹ آیا۔ بچوں کو چھوڑنے کے بعد دوبارہ شہر میں نکلا تو خبر ملی مارگلہ ٹاور کی کئی منزلہ عمارت گر گئی ہے اور سینکڑوں لوگ وہاں دب کر مارے گئے ہیں۔ شام تک آہستہ آہستہ خبریں آنا شروع ہوئیں تو معلوم ہوا مظفر آباد شہر سمیت ایک وسیع تر پہاڑی سلسلہ بری طرح اس سے متاثر ہوا ہے۔ وہ علاقے کہ جہاں کبھی فطرت کے حسن میں ڈوبی سرسبز و شاداب وادیوں میں زندگی رقص کرتی دکھائی دیتی تھی، اب بے یار و مددگار انسانی لاشوں اور ملبے کے ڈھیر سے بھری ہوئی ہیں۔ گاؤں کے گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہیں اور جو زندہ بچے ہیں بے یار و مددگار کھلے آسمان تلے اپنے اپنے پیاروں کو تو کیا روئیں بچی کھچی سانسیں سلامت رکھنے کے لیے بھی امداد کے منتظر ہیں۔

اگلے چند دنوں ہی میں ان علاقوں میں بسنے والوں کے عزیز و اقارب اور ملک بھر سے امدادی سامان لے کر جانے والی مختلف سماجی تنظیموں اور صحافیوں کے گروہ در گروہ اسلام آباد آن پہنچے اور اڈوں میں موجود گاڑیوں کی ایسی قلت پڑی کہ لوگ چار چار گنا کرایہ ادا کرتے ان علاقوں کو روانہ ہوئے۔ ایسے میں اُسے بھی بھاری رقم کے عوض مظفر آباد کی سواری ملی اور وہ اسے لیتا مظفر آباد روانہ ہو گیا۔

راستے میں جگہ جگہ لینڈ سلائڈنگ سے بلاک ہوتے راستوں سے گزرنے کے لیے اُسے بار بار رُکنا پڑا۔ مظفر آباد پہنچا تو بے اختیار اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ شہر کیا تھا فقط ملبے کا ڈھیر تھا۔ یہ وہی

شہر تھا کہ کبھی جہاں وہ سواری لے کر آتا تو اُسی کا جی چاہتا یہیں کا ہو رہے۔ بلند و بالا سرسبز و شاداب پہاڑوں کے بیچ یہ خوبصورت شہراب مسمار کی ہوئی کوئی بستی تھی۔ مکانات منہدم تھے اور انسانی لاشیں ہر سو یوں بکھری ہوئی تھیں کہ دیکھ دیکھ کر جان حلق میں آن اٹکتی تھی۔ اس نے سواری کو وہاں چھوڑا تو واپسی کے لیے اُسے بے شمار لوگوں نے گھیر لیا۔ واپسی کی یہ چند سواریاں لیتا وہ جلد از جلد موت کی اس بستی سے نکل جانا چاہتا تھا، مگر نکلنے سے پہلے نجانے کیوں ایک لمحے کو اُسے شفیع محمد اور اُس کے بچوں کا خیال آ گیا۔

وہ سب کس حال میں ہوں گے؟ ہوں گے بھی یا۔۔۔۔

مگر اس خیال کے ساتھ ہی اپنے بھائی کی راہ دیکھتے اُس کے مرے ہوئے باپ کا چہرہ بھی اُس کے سامنے آن موجود ہوا تو یک لخت اُس کا دل انتقام اور بے حسی کی سختی سے بھر گیا اور وہ اُن کی خبر گیری کے اس خیال کو جھٹکتا واپس روانہ ہو گیا۔

پنڈی اسلام آباد میں اگلے کئی ہفتوں تک اُسے وافر سواریاں ملتی رہیں۔ ان لُٹے پُٹے بے بس لوگوں اور آفت نے اُس کے گھر خوشحالی کا بندوبست کر دیا تھا۔ ایک رات گھر واپسی پر اُس نے ٹی وی پر حکومت کی طرف سے کیا گیا یہ اعلان سنا کہ حکومت مرنے والوں کے لواحقین کو فی کس لاکھ روپیہ ادا کرے گی تو اُسے نجانے کیوں لاکھ روپے کا یہ ذکر سن کر پھر سے نئی گاڑی کے تصور نے آن گھیرا۔

لاکھ روپیہ فی کس!

اس اعلان نے آدھی رات کے وقت پھر سے اُس کے کانوں میں سرگوشی کی تو دائیں بائیں کروٹیں بدلتا وہ بے چین سا ہو گیا۔

شفیع محمد اور اُس کے گھر والے کیا زندہ ہوں گے یا؟

نجانے اچانک کہاں سے اس خیال نے اُسے آ نکھیرا اور اُسے اُس روز مظفر آباد سے اُن کی خبر لیے بغیر واپس لوٹ آنے پر عجب شرمندگی سی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے لاکھ چاہا کہ اس خیال کو ذہن سے کہیں جھٹک دے مگر خیال تو جیسے ذہن سے چپک سا گیا تھا۔

اُٹھ کر پانی کے دو گلاس پینے، یونہی بے وجہ چھت کی کڑیاں گنتے اور دائیں بائیں کروٹیں بدلنے پر بھی اُسے چین نہ آیا تو وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

کچھ بھی ہو شفیع محمد آخر تھا تو اُس کا چچیرا بھائی ہی۔ اس کا اپنا خون۔

خون سے محبت کے اس جوش نے اُسے مجبور کیا کہ اُسی صبح اُن کا پتہ لینے مظفر آباد جائے۔ ادھر مسجد میں موذن نے صبح کی اذان دی اور اللہ اکبر کی صدا پر پو پھوٹنے کا انتظار اُس سے نہ ہوا تو وہ گاڑی نکالتا مظفر آباد روانہ ہو گیا۔

مظفر آباد پہنچا تو حالات اب نسبتاً قابو میں تھے۔ زندگی آہستہ آہستہ پھر سے اپنے معمولات کی طرف پلٹ رہی تھی۔ امدادی ٹیمیں اور عارضی خیمہ بستیوں میں سے اُٹھتے دھوئیں چولہوں کے جلنے کی

خبر دے رہے تھے۔ ٹوٹی ہوئی عمارتوں کا ملبہ سمیٹا جا رہا تھا اور بچی کھچی عمارتوں کی از سرِ نو تعمیر کا کام بھی شروع تھا۔ ایسے میں وہ شفیع محمد کے گھر پہنچا کہ جہاں سے وہ کبھی پلٹ آیا تھا۔ گھر آج کہاں تھا فقط ملبے کا ڈھیر تھا۔ گیٹ کے ٹوٹے ہوئے پِلّر پر شفیع محمد کے نام کی تختی اب بھی سلامت تھی۔ آس پاس سے معلومات لینے پر اُسے پتہ چلا کہ شفیع محمد اس کی بیوی اور ایک بچہ تو اس آفت میں زندہ نہ بچ سکے مگر اُن کا پانچ برس کا ایک بیٹا زندہ ہے جو زخمی حالت میں لاوارث بچوں کے کیمپ میں لواحقین کا منتظر ہے۔

وہ کیمپ پہنچا تو بے شمار لاوارث بچوں کے بازوؤں پر شناخت کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، جن پر اُن کا نام اور والدین کے نام درج تھے۔ اُس نے حمزہ شفیع کی پٹی والے سہمے ہوئے بچے کو لپک کر سینے سے لگا لیا اور پھر بعض ضروری شواہد اور کارروائی کے بعد اُسے لیتا واپس گھر روانہ ہو گیا۔ راستے میں رُک کر اس نے اسے کھلونے، ٹافیاں اور کھانے کی چیزیں بھی لے دیں مگر بچے کی آنکھیں تو خوف سے پتھرا گئی تھیں۔

گھر پہنچا تو اُس کی بیوی اور بچوں نے بھی اُسے خوشی سے قبول کیا۔ شام کو وہ اُس کے لیے نئے کپڑے بھی خرید لائے۔

اگلے روز وہ دوبارہ اڈے کی طرف نکلا تو پہلے کچہری کی طرف مڑا اور وہاں بیٹھے ایک عرضی نویس سے ضروری مشاورت کے بعد شفیع محمد کے اس بچے کا اکلوتا وارث ہونے کا تصدیق نامہ اور متعلقہ محکمے سے مرنے والے تین افراد کے معاوضے کا کلیم بنواتا دفتر میں جمع کروا آیا۔ اُس رات پھر وہ رات بھر سو نہ سکا۔

شفیع محمد کی موت کا یہ تاوان، حمزہ کی پتھرائی ہوئی آنکھیں اور مرے ہوئے باپ کا چہرہ الگ الگ نجانے کیسے کیسے خیالات اُس کے ذہن میں آتے مگر پھر ٹیکسی اسٹینڈ سے نکلتی نئے ماڈل کی چمکتی ہوئی گاڑی کے اُنگلی کے اشارے سے گھومتے اسٹیرنگ کا خیال ان تمام خیالات پر حاوی ہو جاتا۔

کہاں لاکھ اور کہاں تین لاکھ۔

نیند پھر سے نہ آئی تو کڑیاں گنتے گنتے وہ اس رقم کو بھی گننے لگا۔

پچاس کو تین سے ضرب دی اور خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھا۔ کہیں وہ پھر سے کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

نہیں یہ سب تو جیتی آنکھوں کا سچ تھا۔

اُس نے پھر سے گننا شروع کیا۔

ہزار کو سو سے اور پھر سو کو تین سے ضرب دی۔

انگلیوں پر حساب لگایا، ذہن میں گننے کی کوشش کی مگر نہیں اتنی بڑی رقم وہ کیسے اکیلا گن سکتا تھا؟

اُدھر پھر موذن نے صبح کی اذان دی۔

اللہ اکبر۔۔۔ اللہ اکبر۔

بے شک۔ بے اختیار اُس نے کہا اور چپل پہنتا وضو کرنے کے لیے غسل خانے کو چل دیا۔

☆☆☆

صابر ظفر

(۱۸/اکتوبر کے تناظر میں)

کس سے کہیں کہ بوجھ کسی کا اُٹھایئے
اُٹھیے اور اُٹھ کے اپنا ہی لاشہ اُٹھایئے

یہ سیرگاہ آپ کو مرغوب تھی بہت
بکھرا پڑا ہے رنگِ نظارہ اُٹھایئے

یہ نقدِ جاں تو صرف امانت ہے آپ کی
کھوٹا کھرا ہے جیسا بھی سکّہ اُٹھایئے

ان وادیوں میں جن کے لیے آبشاریں تھیں
وہ وقت ہے کہ اب اُنہیں پیاسا اُٹھایئے

ہم سو گئے تو اپنے سبھی لال سو گئے
کس کے لیے زمیں سے کھلونا اُٹھایئے

گھنٹی سُنائی دی نہیں کیا تم کو موت کی
اسکول بند ہو چکا ، بستہ اُٹھایئے

چاروں طرف ہی ایک دھنک ہے بچھی ہوئی
کس سے کہیں کہ اپنا دوپٹہ اُٹھایئے

منزل کی سمت جانے کا رستہ تو ہے مگر
پاؤں نہیں رہے تو قدم کیا اٹھائے

کافی نہیں ہے ایک ہی مصرع کی زندگی
کہتی ہے موت ، دوسرا مصرع اُٹھایئے

احساس کچھ سوا ہُوا ہر زلزلے کے بعد
دُنیا میں رہ کے منّتِ دُنیا اُٹھایئے

ہر سمت ایک جیسا ہی سودا اجل کا ہے
مہنگا نہیں قبول تو سستا اُٹھایئے

سیلابِ مرگ آئے نہ بارِ دگر اِدھر
اب آسمان تک کوئی پُشتہ اُٹھایئے

ممکن ہے آخرت میں کسی نفع کا حصول
آئے ہیں دہر میں تو خسارہ اُٹھایئے

کیسا حسین شخص یہاں سے گزر گیا
یوسف کی سمت ، چشمِ زُلیخا اُٹھایئے

اب ہر بساط اُلٹ چکی ، بازی پلٹ چکی
بے سُود ہے جو اب کوئی مُہرہ اُٹھایئے

فرہاد تھے ، پہاڑ بہت کاٹتے تھے آپ
اب قبر کھودنے کو بھی تیشہ اُٹھایئے

مجھ کو عزیز آپ سے بڑھ کر نہیں ہے جاں
حاضر ہے میرے خُوں کا عطّیہ ، اُٹھایئے

کشمیر ہو نہیں رہا آزاد ، رنج تھا
اب رنجِ قیدِ مرگ ہمیشہ اُٹھایئے

شاید طفیل اُسی کے ملے زندگی کی بھیک
ہاتھوں میں اپنے کوئی صحیفہ اُٹھایئے

مٹّی تلے دبے تو نکالا گیا ہمیں
احسان اب زمیں کا دوبارہ اُٹھایئے

ایسا نہ ہو کہ ہم کوئی گمنام ہوں شہید
رکھنے کو اپنی قبر پہ کتبہ اُٹھایئے

بوئے بہار آئے گی اُس خاک زاد سے
اُس پر گرا ہُوا ہے جو تودہ اُٹھایئے

اُن پر سلام ، آئے جو اِس قتل گاہ میں
کوئی قدم تو آپ بھی ایسا اُٹھایئے

جینے کی آرزو تھی سو پوری نہیں ہوئی
کیا بار بار ، بارِ تمنّا اُٹھایئے

اس سانحے پہ سارا زمانہ ہے اشک بار
لازم ہے نازِ چشمِ زمانہ اُٹھایئے

مانا کہ شک نہیں ہے محبت میں آپ کی
لیکن نہ ٹوٹے دل ، اسے ایسا اُٹھایئے

یہ قوم متحد ہوئی ، مشکل ہی میں سہی
اب اس سے فیضِ کارِ مسیحا اُٹھایئے

بروقت ہونا چاہیے تھی درد کی دوا
تاخیر کی گئی ہے تو صدمہ اُٹھایئے

جاگی ہے ساری قوم ، حکومت سے پیش تر
جب تک یہ خود نہ جاگے ، نہ وللہ اُٹھایئے

کچھ لوگ اب رہیں گے نہیں ساتھ آپ کے
اب فائدہ علاحدگی کا اُٹھایئے

کشمیر کی طرح نہیں جینے کی آرزو
سُن لیجے التجا کہ نہ ملبہ اُٹھایئے

اپنا تو اب ہے گورکنوں سے معاملہ
کس سے کہیں کہ آیئے ، زندہ اُٹھایئے

غفلت شعاریوں کا نہ دیجے ہمی کو دوش
کچھ آپ بھی ندامتِ دنیا اُٹھایئے

میرے لیے تو موت ہی خوراک بن گئی
اب آپ اپنے واسطے کاسہ اُٹھایئے

ہونا تھا اپنی جا پہ جنہیں وہ وہاں نہیں
اُنگلی کسی کی سمت نہ بے جا اُٹھایئے

لوگ اب بھی مر رہے ہیں سرِ کوہ و سبزہ زار
فرصت ملے تو لطفِ تماشا اُٹھایئے

مت دُور جایئے کوئی امداد بانٹنے
بخشش میں آپ کا ہے جو حصہ اُٹھایئے

میں دیکھتا ہوں ساری رعایا کو اشک بار
آپ اپنی شکل دیکھیے ، شیشہ اُٹھایئے

پسماندگاں میں کس کی مجال ، اتنا پوچھ لے
امداد کس کو پہنچی ہے پردہ اُٹھایئے

دیکھا نہیں ہے آپ نے گرتے ہوئے انہیں
اب گر چکے مکان تو سر کیا اُٹھایئے

واقف نہیں رہے ہیں اگر آپ موت سے
کچھ لذتِ قیامتِ صغریٰ اُٹھایئے

جیتے ہیں ایک ساتھ تو مرتے ہیں ایک ساتھ
ہم کو الگ الگ نہ خُدارا اُٹھایئے

رب نے اُٹھا لیا ہمیں ، پروا ہی پھر ہے کیا
اب آپ اُٹھایئے نہ ہمیں یا اُٹھایئے

آئے ہیں آپ لُوٹنے اسبابِ رفتگاں
پھیلا ہوا ہے موت کا سایا اُٹھایئے

زحمت تو کیجے اُٹھنے کی اے خوش خرامِ ناز
کوئی طناب کھینچیے ، خیمہ اُٹھایئے

بس اتنی عرض ہے کسی نازک مزاج سے — اُٹھتا نہیں پہاڑ تو ذرّہ اُٹھایئے
مانا مدد کو آئے نہیں جن کو آنا تھا — کیا مسئلہ ہے اس کے علاوہ اُٹھایئے
رکھتے ہیں آپ جذبۂ تعمیرِ نَو اگر — دفنانے کو ، ریاستی ڈھانچہ اُٹھایئے
آگے نصیب ہے کہ جو آئے وجود میں — بنیاد تو خیال کی پُختہ اُٹھایئے
جس چھت کی آرزو تھی وہی سر پہ آ گری — اب آرزو کے بوجھ کو تنہا اُٹھایئے
اپنے قریب رہیے کہ ہو جایئے نہ گم — جو دور جا گرے ہیں وہ اعضاء اُٹھایئے
یہ خانۂ اجل ہے یہاں زندہ کون ہے — کس طفل کے لیے کوئی توشہ اُٹھایئے
وہ زندگی تو آپ سے اب دُور جا چکی — غم کم اُٹھایئے کہ زیادہ اُٹھایئے
فرصت کی زندگی ہے ظفر آپ کو نصیب — آفت رسیدگاں کا جنازہ اُٹھایئے

☆☆☆

ڈاکٹر انور سدید

کچھ ایسے اپنا مقدر پچھاڑ ڈالا ہے
کہ جو تھا نقشِ تمنا بگاڑ ڈالا ہے

حدِ نگاہ تلک چار سو تھی تاراجی
یہ کس نے میرے جہاں کو اُجاڑ ڈالا ہے

زمین دیکھے گی ، اب ماورا کا منظر بھی
کہ ہم نے خیمۂ افلاک پھاڑ ڈالا ہے

جہانِ نو کی نہ تعمیر ہو سکی ممکن
جہانِ کہنہ کو گرچہ پچھاڑ ڈالا ہے

نظر میں کوئی وسیلہ نہیں تلافی کا
تعلقات میں کیسا بگاڑ ڈالا ہے

رقم اسی پہ تھا دل کا تمام افسانہ
بیاض سے جو ورق اس نے پھاڑ ڈالا ہے

وہی کرے گا اب انور سدید بخیہ گری
کہ جس نے میرا گریبان پھاڑ ڈالا ہے

ڈاکٹر انور سدید

یہ کیسے لوگ تھے جو دھیان سے نہیں گزرے
وہ کیسے لمحے تھے جو شان سے نہیں گزرے

انہیں یہ کیسے بتاؤں کہ زندگی کیا ہے
جو حادثات کے طوفان سے نہیں گزرے

اٹھا کے موج انہیں ساحلوں پہ پھینک گئی
وہ چند تنکے جو طوفان سے نہیں گزرے

نکل تو آیا ہوں میں قیدِ جسم سے لیکن
جو رت جگے تھے مری جان سے نہیں گزرے

میں ان کی آگ میں اب جل رہا ہوں کیوں انوؔر
جو سانحے مرے اوسان سے نہیں گزرے

☆☆☆

خاور اعجاز

سر جو دستار سے گزرتا ہے
منصبِ دار سے گزرتا ہے

چاندنی میں نہا گیا دریا
کون اُس پار سے گزرتا ہے

دوسری سمت ڈھلنے سے پہلے
سایہ دیوار سے گزرتا ہے

گھر کی تہذیب تک پہنچنے کو
آدمی غار سے گزرتا ہے

کب مِرے ساتھ ہے، زمانہ تو
اپنی رفتار سے گزرتا ہے

اُس پہ کھلتا ہے رازِ گریہ جو
ضبطِ اظہار سے گزرتا ہے

زیست اک خواب ہے مگر اکثر
آنکھ کے پار سے گزرتا ہے

اُس کا اقرار کرنے والا بھی
پہلے انکار سے گزرتا ہے

خاور اعجاز

دل جو آباد کرتے جاتے ہیں
ہم کو برباد کرتے جاتے ہیں

کوئی جب سُن نہیں رہا تو کیوں
لوگ فریاد کرتے جاتے ہیں

ذکر کرتے ہیں تیری غفلت کا
اور تجھے یاد کرتے جاتے ہیں

ختم کرتے نہیں تسلسلِ شوق
ظلم ایجاد کرتے جاتے ہیں

پَر پرواز جو بھی آتا ہے
نذرِ صیاد کرتے جاتے ہیں

عشق مزدوری و جنوں ہی سہی
نامِ فرہاد کرتے جاتے ہیں

☆☆☆

خاور اعجاز

کچھ نہیں تھا کام اُس کے شہر میں
ہو گئی پر شام اُس کے شہر میں

یہ ہُوا آنے سے میرے ایک دن
گِر گئے ہیں دام اُس کے، شہر میں

کہہ دیا مَیں نے اُسے جانِ غزل
مچ گیا کہرام اس کے شہر میں

عمر بھر بیٹھے پھر اُس کے در پہ وہ
جو چلے دوگام اُس کے شہر میں

گونجتا ہے کیوں، اُسے یہ فکر ہے
اور بھی اِک نام اُس کے شہر میں

ہر کوئی ہے اُس کی زلفوں کا اَسیر
یہ وبا ہے عام اُس کے شہر میں

خاور اعجاز

کبھی اُلفت کبھی فرقت ہی نہیں مل پاتی
کوئی شے حسبِ ضرورت ہی نہیں مل پاتی

اتنی تیزی سے نئے خواب نظر آتے ہیں
ہمیں تعبیر کی فرصت ہی نہیں مل پاتی

دل کا ملنا تو بہت دُور ہے ہم لوگوں سے
آپ جیسوں کی طبیعت ہی نہیں مل پاتی

کیا بتائے گی ہمیں واقعہ اور کیا تفسیر
حاشیے سے جو عبارت ہی نہیں مل پاتی

تم نے کیا سوچ کے جذبات کی بولی، بولی
دل کے سودے میں تو قیمت ہی نہیں مل پاتی

☆☆☆

خاور اعجاز

پھر وہی منزلِ دُشوار نظر آنے لگی
کہیں خنجر کہیں تلوار نظر آنے لگی

اِس کنارے نہ رُکے ایک بھی لمحے کے لیے
جنہیں قندیل سی اُس پار نظر آنے لگی

ہم کسی ٹھہری ہوئی شب کے تمنائی ہیں
ہمیں ہر روشنی بیکار نظر آنے لگی

میری جیبوں میں کھنکنے لگی چاندی جب سے
ایک دنیا مِری غمخوار نظر آنے لگی

پنجۂ جبر سے یوں مجھ کو رہائی نہ مِلی
سَر چھپایا تھا کہ دستار نظر آنے لگی

خاور اعجاز

جو محبت سے قدم رکھتا ہوا چلتا ہے
وقت بھی اُس کا بھرم رکھتا ہوا چلتا ہے

دیکھتا ہے وہ ذرا اور طرح کے منظر
جو ذرا آنکھ میں نم رکھتا ہوا چلتا ہے

کوئی پتھر کے زمانے سے یہاں ہے لیکن
سینۂ سنگ میں دَم رکھتا ہوا چلتا ہے

وقت رہتا ہے ہمیشہ مِرے آگے آگے
اور مری راہ میں خم رکھتا ہوا چلتا ہے

یاد کرتا ہے تری پیاس کو دریائے فرات
اور اُچھل جانے کا غم رکھتا ہوا چلتا ہے

☆☆☆

افضل گوہر

کب چاند بن سکا ہے دعا سے چراغ کا
بس شعلہ جل رہا ہے ہوا سے چراغ کا

ہم لوگ رکھ کے بھول گئے یوں ہی طاق میں
رشتہ تھا کوئی ارض و سما سے چراغ کا

جنگل کہاں بھڑکتا ہے جگنو کی آگ سے
اِتنا بُرا نہ مان ذرا سے چراغ کا

اِس آئنے کی لَو میں کسی کا جمال ہے
چہرہ نہ ڈھانپ اپنی ردا سے چراغ کا

اچھا نہیں تھا گوندھی ہوئی خاک کا خمیر
پُتلا ہوا خراب گھٹا سے چراغ کا

کتنا عجیب دُکھ ہے ہوا سے شکست کا
چہرہ جھلس گیا ہے اَنا سے چراغ کا

افضل گوہر

جئیں تو کیسے جئیں تہمتِ چراغ کے ساتھ
یہاں تو دل بھی جلائے گئے دماغ کے ساتھ

یہ سارے سُوکھے ہوئے پیڑ سبز ہوتے تھے
کبھی گزرتی تھی اِک نہر میرے باغ کے ساتھ

تمام شہر خجل ہے نجانے کس پہ گرے
یہ ایک کانچ کی دیوار اپنے داغ کے ساتھ

بہت اُڑایا گیا تیرگی کا گردوغبار
تبھی تو جالے لگے ہیں یہاں چراغ کے ساتھ

کسی سے عشق کوئی کھیل تو نہیں گوہؔر
سو دل کا سوچنا پڑتا ہے اب دماغ کے ساتھ

☆☆☆

حسیؔر نوری

زندہ رہنے کی لگن دل میں اگر ہو جائے
زندگی مظہرے خورشید و قمر ہو جائے

لطف جینے کا کسی طور نہیں آئے گا
سکھ کے سائے میں اگر عمر بسر ہو جائے

کتنا ویران ترے شہر کا منظر ہو گا
مجھ سا دیوانہ اگر شہر بدر ہو جائے

قطرۂ اشک کو توفیق میسر ہو اگر
میری آنکھوں میں ڈھلے اور گہر ہو جائے

خوف ہے مجھ کو کہ یہ جس زدہ موسم پھر
راہِ ہستی میں نہ سرگرم سفر ہو جائے

حسب وعدہ جو ملاقات کی صورت نکلے
کتنا پر نور یہ خوابوں کا نگر ہو جائے

اک نئی منزلِ مقصود کی مجھ کو ہے تلاش
کاش ہر نقش قدم راہ گذر ہو جائے

رُخ پہ بکھری ہوئی زلفیں جو سمٹ جائیں حسیؔر
تیرگی توڑ دے دم اور سحر ہو جائے

حسیؔر نوری

اپنا سمجھا تھا جسے غیر وہ سایہ نکلا
دھوپ کے شہر میں دیکھو میں کہاں آ نکلا

رہ گزارِ غم ہستی میں بھٹکنے کے لیے
روح تو روح تھی احساس بھی پیاسا نکلا

جب گھٹن بڑھنے لگی دوستو میں کیا کرتا
پھر نہ لوٹا میں کبھی گھر سے میں ایسا نکلا

ہم سمجھتے تھے کہ بھر جائے گا یہ وقت کے ساتھ
اب پریشاں ہیں کہ یہ زخم تو گہرا نکلا

خواب و خواہش ہیں مرے یا کہ چمکتی
بند مٹھی میں مرے تم ہی کہو کیا نکلا

مختلف جس کو زمانے سے سمجھتا تھا حسیؔر
کیا ستم ہے کہ وہ ہم رنگِ زمانہ نکلا

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

بانہوں کے حلقے میں وہ پری زاد ہووے گی
کیا اس کے بعد وقت کی معیاد ہووے گی؟

عشاق ہم سے کتنے ہی برباد ہو گئے
کیا وہ گلی مہکتی ہوئی شاد ہووے گی؟

جب اک ہجوم دل میں سمیٹے ہوئے ہو تم
پھر اس کی یاد کس طرح آباد ہووے گی

آخر کہیں تو جبر کا ٹھہرے گا سلسلہ
آخر ہمارے صبر کی بنیاد ہووے گی

کیا دیکھنا کہ کھول دو گھر کے تمام دَر
کیا دیکھنا کہ پھر کوئی اُفتاد ہووے گی

پھر کس کے شہر کے رستوں پہ بھٹکے گی
گر اس زمیں پہ رات مرے بعد ہووے گی

پھر اس کے بعد راستہ ملنا نہیں کوئی
لاحاصلی جو حاصلِ ایجاد ہووے گی

دستاریں رنگ رنگ کی دیکھوں تو ہو گماں
کیا ساری کائنات ہی بغداد ہووے گی

اب ہم بھی خود کو بھولے سے آئے نہیں ہیں یاد
سو تم کو کوئی بات کہاں یاد ہووے گی

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

ہمیشہ رکھے سلامت مرا خدا ترے لب
مرے لبوں پہ مہرباں رہیں سدا ترے لب

ترے لبوں کی طراوت سے سبز ہے مرا دل
مرے لیے تو نمو کا ہیں سلسلہ ترے لب

میں غم کی بھول بھلیوں میں کھو کے رہ جاؤں
اگر مجھے نہ بتائیں کبھی پتا ترے لب

پھر اس کے بعد مجھے عمر بھر نہ ہوش آئے
بس ایک بار پلائیں اگر نشہ ترے لب

ہر ایک منظرِ بے خواب کا مقدر ہیں
دعا دعا تری آنکھیں صدا صدا ترے لب

شارق بلیاوی

جسے دیکھو لبِ دریا کھڑا ہے
تو کیا ان میں ہر اک پیاسا کھڑا ہے

اُٹھائے سر ہر اک جذبہ کھڑا ہے
عجب اک مسئلہ دل کا کھڑا ہے

بہا کر لے گیا دریا کو پانی
تماشہ دیکھنے صحرا کھڑا ہے

اُسے دیکھے نہ کیوں حسرت سے دریا
جو پانی پی کے بھی پیاسا کھڑا ہے

یہی احساس طوفاں نے دلایا
مکاں کی شکل میں تنکا کھڑا ہے

سرِ جادہ سمیٹے حسرتوں کو
کوئی تقدیر کا مارا کھڑا ہے

صدا سن کر مری خاموش ہے کیوں
یہ تو ہے یا ترے جیسا کھڑا ہے

نہیں محروم جس کے پاس زر ہو
جو پیسہ ہو تو ہر سودا کھڑا ہے

یہ روٹی مانگتا ہے یا مقدر
پسارے ہاتھ کیوں لڑکا کھڑا ہے

زمانے کی طرح بدلا ہے یہ بھی
جدا مجھ سے مرا سایا کھڑا ہے

عجب یہ وقت نا پُرساں ہے شارقؔ
جہاں جو بھی ہے وہ تنہا کھڑا ہے

شارق بلیاوی

پیچ و خم جاننے میں دیر لگی
سو ترے راستے میں دیر لگی

بے تردّد تجھے لکھا جاناں!
ہاں مگر حاشیے میں دیر لگی

بعد موت کے آئنہ دیکھا
خود کو پہچاننے میں دیر لگی

جب تلک ڈھئے گئے درودیوار
گھر کی چھت پاٹنے میں دیر لگی

درد تو پی گیا لہو سارا
زخم کو ٹانکنے میں دیر لگی

دیکھ پایا نہ روئے حسنِ نشاط
فصلِ غم کاٹنے میں دیر لگی

دھوپ اُتری تھی گھر کے آنگن میں
خود ہمیں جاگنے میں دیر لگی

جب تلک کھیت چگ گئیں چڑیاں
ہم کو کچھ سوچنے میں دیر لگی

حسن تھا منتظر ستائش کا
اُس طرف دیکھنے میں دیر لگی

منتظر صبح تک رہیں آنکھیں
نیند کو رت جگے میں دیر لگی

خود مزاحم تھی زندگی شارقؔ
عمر یوں کاٹنے میں دیر لگی

کاشف مجید

خدائے ارض و سما اب اک ایسا رستہ بھی
کہ جس پہ چل کے ملے آگ بھی ستارہ بھی

دُعا کے لفظ جہاں روشنی میں ڈھل جائیں
دُعا کے ساتھ مجھے چاہیے وہ دنیا بھی

نہ پوچھ کیسے اُسے زندگی گزارتی ہے
مِری طرح جو مکمل بھی ہو اُدھورا بھی

بھرے جہاں میں جو کھلتا ہے صرف میرے لیے
میں ڈھونڈ لوں گا کسی روز وہ دریچہ بھی

وہ ایک لمحہ کہ جس کو دوام ہے کاشفؔ
یہاں کسی نے اُسے روح میں اُتارا بھی

کاشف مجید

میں تھا ، مِرا اسباب نہیں تھا
جب آنکھ کھلی خواب نہیں تھا

وہ رات عجب رات تھی اُس رات
کھڑکی میں بھی مہتاب نہیں تھا

اِس بار وہ آیا تھا تو اُس پاس
آنکھیں تھیں کوئی خواب نہیں تھا

میں زندہ رہا واں بھی جہاں پر
اِک پیڑ بھی شاداب نہیں تھا

تنہا نہ ہوا تھا کبھی اِتنا
جب حلقۂ احباب نہیں تھا

☆☆☆

اوصاف نقوی

کیا ہیں سردی کی سوغاتیں
دیواروں سے دھوپ کی باتیں

ہجر و وصال کا کیسا سنگم
اُجلے دن اور کالی راتیں!

آدم زادے، خاک کے پیکر
کس کو راس آئیں برساتیں

پانی کا تو ایک ہی فرقہ
مٹی کی ہیں کتنی ذاتیں

وقت سا حاکم دیتا جائے
اُن کی جیتیں، ہم کو ماتیں

آنکھوں کو اوصافؔ پڑھو تم
نا کہنے کی کیا ہیں باتیں

اوصاف نقوی

جسم ہے، جان کے ارادے میں
درد ہے غیب کے لبادے میں

بیکراں کب ہیں کرنیں سورج کی
وقت ہے بند ایک وعدے میں

دُنیا شطرنج، ہر نَفَس مہرہ
لطف بازی کا ہے پیادے میں

اپنا مقروض کرکے اک عالم
رنگ اب کیا ہے شام زادے میں

آنکھ مت شعبدے سے خیرہ کر!
اصل جوہر تو ہے برادے میں

برق اوصافؔ آب کا حاصل
روشنی اور وہ بھی مادے میں

☆☆☆

شہاب صفدر

پیش آئے جاگتے ہیں کہ ظاہر ہو خواب میں
ہر بات واقعہ ہے محبت کے باب میں

اے چاند تو بتا نہ بتا جانتے ہیں سب
کن سورجوں کا خوں ہے تری آب و تاب میں

کچھ آنسوؤں کا ذکر ہے رنگینیوں کے ساتھ
خوشیاں کہاں ہیں زندہ دلی کے نصاب میں

جو ہو رہا ہے پیشِ نظر دیکھنا تو ہے
مدت سے مُبتلا ہیں یہ آنکھیں عذاب میں

ہاں شاخِ حرف اپنے مقدر پہ بین کر
اِک اور گُل جدا ہوا عینِ شباب میں

ان وحشتوں کے بعد پھر آباد ہو سکے
اتنی سکت کہاں ترے خانہ خراب میں

جلدی ہے واپسی کی تجھے کس لیے شہابؔ
دو دن مزید ہیں ابھی میرے حساب میں

شہاب صفدر

لوحِ سادہ پر ہے کیا مرقوم کھلتا ہی نہیں
بے بصیرت سرِّ نامعلوم کھلتا ہی نہیں

اس پہ تیری بے تحاشا دستکیں کس کام کی
وہ جو دروازہ دلِ محروم کھلتا ہی نہیں

تیرے میرے ساتھ چلنے سے زمانے پر کھلا
ورنہ ربطِ لازم و ملزوم کھلتا ہی نہیں

شمع بزمِ زندگی ہے آج بھی جن کا خیال
ہو گئے وہ کس طرح معدوم کھلتا ہی نہیں

بارہا جھانکا ہتھیلی کے جھروکے میں مگر
جو ستارہ مجھ سے ہے موسوم کھلتا ہی نہیں

ہر لُغت میں حرفِ حق ہے جادۂ مقتل شہابؔ
دوسری جانب درِ مفہوم کھلتا ہی نہیں

☆☆☆

سجاد مرزا

غزل

یہاں محفوظ ہم اپنے مکانوں میں نہیں ہیں
خلوص و مہر شاید مہربانوں میں نہیں ہیں

عجب سا خوف طاری ہے، سبھی سہمے ہوئے ہیں
کئی دن سے پرندے آشیانوں میں نہیں ہیں

سنہری دور کے ہم خواب کب تک دیکھتے جائیں
حقائق حکمرانوں کے بیانوں میں نہیں ہیں

زمیں پر ہی بہر انداز وہ موجود ہوں گے
شیاطیں آج کل جو آسمانوں میں نہیں ہیں

درندے دندناتے پھر رہے ہیں چار جانب
شکاری جاگتے اپنی مچانوں میں نہیں ہیں

ابھی تخلیق کے لمحے نہیں ہیں ہم پہ اُترے
ابھی ہم لوگ شامل خوش گمانوں میں نہیں ہیں

عجب اک زلزلہ سجاد ہے آیا زمیں پر
کہ شہروں کے نشاں بھی داستانوں میں نہیں ہیں

سجاد مرزا

آج کے شاعر

زندگی بےزار لفظوں کے ہیولے
نظم کی صورت میں ڈھل کر
ذہن کو دھندلا گئے!

آج کے شاعر ہمارے
جانے کیسی
دُور کی کوڑی یہاں لانے لگے

بے سلیقہ، بے ارادہ
بے معانی، غیر سنجیدہ سے پیکر
نظم کی صورت گری میں
اس طرح لائے کہ ان کی دُم نمایاں ہوگئی!

آدمی کو جانور دکھلا کے
کتنے خوش ہوئے

آج کے شاعر ہمارے
جانے کس جنگل میں ہیں؟

☆☆☆

فہیم شناس کاظمی

اور جینے کو۔۔۔

ابر آئیں گے چلے جائیں گے
خالی مشکیزوں میں اب ریت بھری جائے گی
کوئی دریا کو سلامی کیوں دے
بوند پانی کی نہیں
زندگی روتی ہوئی
مرتی ہوئی
انہیں رستوں پہ بکھر جائے گی
جن پہ سایہ بھی نہیں
کوئی کردار کہیں مرجائے
اور کہانی میں کہیں درد کا لمحہ بھی نہیں
شب کے دامن سے ستارے چن کر
آنکھوں میں ریت بھری جائے گی
اور جینے کو کہا جائے گا

ایک چٹکی بھر نظم

آسمان بھر روشنی میں
گم ہوا جاتا ہے دن
بھیگتی جاتی ہے شام
ڈوبتی آواز کے گہرے سمندر میں کہیں
پھنکارتا طوفان ہے
رات کی دہلیز پر
دم توڑتا تنہا دیا
گریہ کرتی زندگی
ایک چٹکی روشنی؟

☆☆☆

محمد فیروز شاہ

بہشتِ ارضی لہولہو ہے

(۸/اکتوبر کے تناظر میں)

ملول آنکھوں میں رتجگا ہے ، بہشتِ ارضی لہو لہو ہے
دلوں میں کہرام مچ گیا ہے بہشتِ ارضی لہو لہو ہے

وہ حشر سامان زلزلہ تھا کہ سوچ اب تک لرز رہی ہے
سسکتی آتی ہوئی ندا ہے بہشتِ ارضی لہو لہو ہے

ہم اپنی دھرتی کے دل میں نفرت کے بیج مدت سے بو رہے تھے
زمیں نے قرضہ چکا دیا ہے بہشتِ ارضی لہولہو ہے

اُجاڑ شاخوں پہ خوف کھائے ہوئے پرندوں کے جھمگٹے ہیں
بلکتی پھرتی ہوئی ہوا ہے بہشتِ ارضی لہو لہو ہے

یہ دُکھ بٹانے کا وقت ہے اور کام آنے کی ساعتیں ہیں
پکار کرتی ہوئی صدا ہے بہشتِ ارضی لہو لہو ہے

جھکائیں سر اور ہاتھ اُٹھائیں رحیم و رحمان رب کے آگے
یہی تو اب ساعتِ دعا ہے بہشتِ ارضی لہولہو ہے

سنو! مداوا ہے اس الم کا فقط محبت ، سو ہم سبھی کو
وفا کا مرہم ہی بانٹنا ہے بہشتِ ارضی لہو لہو ہے

ہمیں ہے ملبے سے گھر اٹھانا پھر اس کو چاہت سے ہے بسانا
اگرچہ اُجڑی ہوئی فضا ہے بہشتِ ارضی لہولہو ہے

ہمیں ہے فیروزؔ مل کے تعمیرِ نو کی خاطر قدم بڑھانا
نئے سرے سے ہے گھر بسانا بہشتِ ارضی لہولہو ہے

☆☆☆

ڈاکٹر سید جاوید اختر

گدھ

لیے ہاتھ میں ایک چھوٹا سپیکر
جنابِ مشرف یہ فرما رہے تھے
''مرے بھائیو، اور میرے بزرگو!
مجھے علم ہے کہ تباہی مچائی بڑی زلزلے نے
مصائب تمہارے سبھی جانتا ہوں
تمہارے دُکھوں پہ مری رات کی نیند سی اُڑ گئی ہے''
جنابِ مشرف خطابت کے جوہر دکھا ہی رہے تھے
کہ مجمع سے اک شخص اُٹھا
مخاطب کیا اُس نے عالی قدر کو
''ہماری مدد کو ہیں جتنے بھی انگریز آئے
خدا کی قسم وہ فرشتوں سے کم تر نہیں ہیں
سپاہی بھی جتنے ہیں پاک آرمی کے
ہیں وہ بھی خلوص و محبت کے پیکر
مگر صاحبِ محترم! یہ حقیقت ہے سُن لیں
بظاہر رضا کار ہیں جو سول کے
سبھی تو نہیں، پر ہیں اکثر لٹیرے
یہ بھیڑوں کے ملبوس میں بھیڑیے ہیں
ہماری غریبی کو پہچان کر یہ
یہاں کے مویشی بڑے سستے داموں
لیے جا رہے ہیں!
کُدالیں چلاتے ہیں ملبے کے اندر
کہ پائیں کوئی قیمتی شے
کسی نو بیاہتا کا زیور
کسی باپ کی عمر بھر کی کمائی
یہ سچ ہے، نہیں ڈھونڈتے یہ
ہمارے پیارے عزیزوں کی لاشیں
فقط ڈھونڈتے ہیں، یہ مطلب کی چیزیں
خدا کے لیے ہم کو ان سے بچائیں
یہ گدھ ہیں، مبادا ہمیں نوچ کھائیں۔''
جنابِ مشرف نے بپتا سنی تو
کڑک کر یہ بولے:
''اگر آدمی ایسا منحوس پکڑو
تو فوراً اُسے تم وہیں ڈھیر کردو
اجازت ہے تم کو یہ میری طرف سے
ملے گر لعیں، دشمنِ قوم ایسا
تو اُس کو اُسی دم جہنم کا رستہ دکھاؤ۔''
جنابِ مشرف کا فرمان سن کر
جو مجمع سے اُٹھا تھا مردِ قلندر
خجل ہو کے بولا۔ صدائے خفی سے
''اگر ہم میں ہوتی، ذرا سی بھی ہمت
تو ہم آپ سے ایسے فریاد کرتے؟''

☆

حروفِ زر

(قارئین کے خطوط)

اکتوبر۲۰۰۵ء کا ''انگارے'' موصول ہوا شکریہ۔ آپ کا اداریہ ''چند باتیں'' صاحب علم و ادب کے لیے جو ادب میں سنجیدہ ہیں دعوتِ غور و فکر دے رہا ہے۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو آپ کی معروضات یا بلیغ اشارے پر غور کریں گے؟ انسانی اقدار کی ہر جہت متاثر ہو چکی ہے۔ نچلے طبقے کو تو ہم کم علم یا ناخواندہ کہہ کر صبر کریں گے مگر آج کل درسگاہوں اور تربیتی اداروں میں کیا ہو رہا ہے؟ چند کو چھوڑ کر استادان گرامی کے تدریسی کردار پر غور کیا جائے تو سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ یونیورسٹی لیول پر بھی جو کچھ ہو رہا ہے آپ کو اور اہلِ علم کو اچھی طرح معلوم ہے۔ دھڑا دھڑ Ph.D کی ڈگریاں عنایت کی جا رہی ہیں۔ ہر یونیورسٹی سبقت لے جانے پر تُلی ہوئی ہے۔ لیکن جس قسم کے تحقیقی مقالے لکھے جا رہے ہیں وہ تحقیقی تو کم قیاسی زیادہ ہوتے ہیں۔ بس دُھن یہ سوار ہے کہ Ph.D. کی ڈگری مل جائے تا کہ تنخواہ میں اضافہ ہو جائے ویسے ڈاکٹر کی چھاپ کو ڈگری ملنے سے پہلے لگا لیا جاتا ہے۔ ہمارے آج کل کے نگران بھی تساہل یا تغافل سے کام لینے لگے ہیں اور وہ بھی کیا کریں اُن کو بھی تو شوق ہے اپنی ساکھ بڑھانے کا کہ ہم نے اتنے Ph.D. بنا دیئے وغیرہ۔ وہ Ph.D. کس قسم کے ہیں اُن کے اپنے ہی مضمون میں قابلیت کا معیار کیا ہے کون دیکھتا ہے بس ڈگری کافی ہے۔ کم از کم دوسروں پر رُعب اور دھونس جمانے کا حربہ تو موثر رہے ہے۔

آپ نے بھارت کے بلراج مین را کے حوالے سے اقتباس دیا ہے ہر جگہ یہی عالم ہے۔ ہم کس قدر سہل پسندی کا شکار ہو گئے ہیں۔ علم حاصل کرنے کے لیے جس دل جمعی یا ذہنی مشقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی راضی نہیں وقت کم ہے مقابلہ (معاشی) سخت ہے۔ اللہ خیر کرے ادبی دنیا کا بھی یہی حال ہے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے۔ نیچے سے لے کر اوپر تک اکثر و بیشتر شاعر اور ادیب شہرت طلب اور مفاد پرست ہو کر رہ گئے ہیں۔ کم علموں کی غلط ہمت افزائی کون کرتا ہے؟ منٹو سے متعلق ڈاکٹر علی ثنا بخاری کا مضمون اور دوسرے مضامین پڑھ کر بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ ادب کی ناؤ کس رُخ جا رہی ہے۔ یہی نہیں کافی لوگوں نے سرقہ کو توارد کے نام پر اپنایا ہوا ہے۔ بغیر تحقیق اِدھر اُدھر سے کاٹ چھانٹ کر کچھ قیاسی فقرے جمع کر کے مضمون تیار کر لیا جاتا ہے آخر نقاد یا بڑا دانشور بھی تو کہلوانا ہے۔ کراچی کی ادبی فضا بھی کم نہیں ہے۔ یہاں بھی من پسندوں کو آگے بڑھانے کی روش جاری ہے۔ بالخصوص خواتین شاعرات کو جو باہر سے ڈالر لاتی ہیں اور عورت کے ناطے تھوڑی بہت کششِ حسن تو ہوتی ہے اچھے اچھوں کو رام کر لیتی ہیں۔ میں نے خود آرٹ کونسل کے دھنک مشاعرے میں ایک محترمہ کو بے وزن شعر پڑھتے سنا۔ لندن سے آئی تھیں۔ منتظم سے میں نے شکایت کی تو کہنے لگے شارق بھائی کیا کریں سفارش بڑی تھی۔ ایسی ہی شاعرات یا شعرا کو جو لندن یا امریکہ پلٹ ہوتے ہیں بڑی دھوم دھام سے مہمانِ خصوصی کے طور پر نوازا

جاتا ہے۔ اُن کے اعزاز میں نشستیں منعقد ہوتی ہیں۔ اُن کی کتابوں کی پذیرائی کا تو پوچھیے مت۔ مقررین فضول اور نام نہاد، نہایت غیر معروف شخصیات کی اس طرح تعریفیں کرتے ہیں بس مت پوچھیے؟ ان کے کلام اور اُن کی شان میں قصیدے ان الفاظ میں بیان ہوتے ہیں کہ نہ پچھلوں میں کوئی تھا نہ اب کوئی ہے۔ اس طرح ادب و شعر کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ صاحب اعزاز اپنے آپ کو مایہ ناز اور ممتاز سمجھ بیٹھتا ہے اس لیے کہ یہ سب الفاظ معروف شخصیات نے کہے ہوتے ہیں۔ ادب میں مسلسل زوال کا عمل جاری ہے اور یہ سب ہمارے اپنے ہی کر رہے ہیں۔ نہ جانے سستی شہرت پسندی اور مفاد پرستی کا قابلِ مذمت رجحان کب ختم ہو گا؟ آپ بار بار اس طرف اشارہ کرتے ہیں اور احساس دلانے کی اپنی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ آپ کے مضامین اور درد بھری فریاد بہ طرز اداریہ سن کر میں بہت کڑھتا ہوں کہ نہ سہی بڑا شاعر مگر کچھ تو ہوں۔ ادب و شعر سے لگاؤ تو ہے۔ میں اردو زبان ادب کی ترقی اور شاندار مستقبل کا متمنی تھا اور ہوں، مگر آپ تو اپنے پرچے میں لکھ کر اپنا ماضی الضمیر بیان کر دیتے ہیں ہم کہاں جائیں۔ کس سے فریاد کریں۔ یہ خط لکھ دیا ہے ضبط نہ ہو سکا پسند آئے تو شائع کر دیجیے گا یا پھر پھاڑ کر پھینک دیجیے گا۔ کم از کم آپ کو تسکین تو ہو جائے گی کہ ایک شخص اور بھی ہے آپ کا ہم خیال۔ لکھنے کو تو پورا مضمون جی چاہ رہا ہے مگر۔۔۔ ویسے میں اخبارات میں کافی مضامین لکھ کر چھپوا چکا ہوں اور کافی سرزنش بھی کی ہے مگر نتیجہ کچھ نظر نہیں آتا۔ خدا آپ کو صحت اور جرأت رندانہ عطا کرے۔ آپ کے پاس ہتھیار ہے آپ مقابلہ کر سکتے ہیں۔ میں تو خالی ہاتھ ہوں۔ آپ کا یہ عمل آپ کے ادبی فرائض کا حصہ ہے سو کرتے جائیے۔ کم از کم دل کو ڈھارس تو ہو جائے گی کہ ہم نے آواز اُٹھائی ہے۔

(شارق بلیاوی، کراچی)

''انگارے'' کا ۳۴واں شمارہ ہم چشم ہوا، اِس خلوصِ مسلسل پر شکریہ۔ آپ کی ''چند باتیں'' والی گفتگو کی ہم توثیق کرتے ہیں۔ ڈاکٹر علی ثنا اور طاہر عباس کی منٹو کے حوالے سے متحقق گفتگو پسند آئی۔ مضامین میں ڈاکٹر ضیاالحسن اور روبینہ شاہ جہان کی تحاریر علم افروز تھیں۔ افسانے ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ نظم و غزل کا حصہ اب کی خاصا کمزور تھا۔ البتہ قاضی حبیب الرحمٰن اور خاور اعجاز کے چند اشعار اچھے لگے۔

۸/اکتوبر کی صبح وطنِ پاک میں تاریخِ انسانی کا شدید ترین زلزلہ آیا۔ آن کی آن میں اینٹ کے گھر مٹی ہو گئے، خدشہ ہے کہ اِس ارضی آفت سے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ افراد جاں بحق ہوئے اور ایک لاکھ کے لگ بھگ افراد زخمی اور پینتالیس لاکھ افراد بے سائیاں ہو گئے۔ ۲۸/ ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے میں وہ تباہی مچی کہ الاماں۔ بیسیوں قصبات صفحۂ خاک سے مٹ گئے، چہار سُو آہ و زاریاں ہو رہی ہیں۔ بقول خود:

ہر اِک گھر میں صفِ ماتم بچھی ہے
سب اپنے رفتگاں کو رو رہے ہیں

اُس ذاتِ حمدیت کے حضور ہم اپنا سر فرو لاتے ہوئے دُعا کا مصلّٰی بچھاتے ہیں۔ دعا ہے کہ

اللہ رحیم اس کٹھناور سانحے میں شہید ہونے والوں کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔آمین۔

یقیناً اس قومی المیے کے اردو ادب پر بہت گہرے اور تادیر اثرات مرتب ہوں گے۔اللہ کرے ہم من حیث القوم اِس کڑی آزمائش سے سرخ رُو ہو نکلیں۔عید کی مبارک باد کے ساتھ۔

(پرویز ساحر،ایبٹ آباد)

سلامِ رحمت، پہلے تو میں نے اپنا احتجاج درج رجسٹر کرانا ہے کہ آپ نے اکتوبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں پڑھنے والوں کو اہمیت نہیں دی۔ان کے خطوط کی رسید تو دے دی لیکن لکھنے والوں کو ان کے تاثرات سے محروم کر دیا۔''انگارے'' میں خطوط کے حصے کی شان ہمیشہ امتیازی رہی ہے اور یہ حصہ سب حلقوں میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے۔آپ چاہیں تو اس نقطے پر ریفرینڈم کرا سکتے ہیں۔مجھے یقین ہے کہ نتائج خطوط کی اشاعت کے حق میں آئیں گے۔

منٹو شناسی کے باب کو آپ نے توسیع دی اور بعض غلط فہمیوں کو رفع کرنے کی کاوش بھی کی اور یہ خوش آئند ہے۔جی سی یونیورسٹی سے شائع ہونے والی کتاب ''سعادت حسن منٹو (پچاس برس بعد)'' کے بارے میں ڈاکٹر علی ثنا بخاری صاحب کو شکایت تھی کہ اس کتاب میں شامل ''سعادت حسن ماہ و سال کے آئینے میں'' کے مولف شمشیر حیدر شجر نے ان کے پی ایچ۔ڈی کے مقالے سے استفادہ کیا لیکن پورے مضمون میں کہیں بھی اس کی نشاندہی نہیں کی۔میں نے ٹیلی فون پر ان سے گزارش کی کہ آپ نے بھی تو کمال کیا ہے کہ اتنا اہم مقالہ ابھی تک شائع نہیں کیا۔طاہر عباس صاحب نے زیرِ نظر ''انگارے'' میں وضاحت کر دی ہے تو اب شاید ڈاکٹر بخاری صاحب کی تشفی ہو گئی ہوگی۔تاہم مجھے یاد پڑتا ہے کہ شمشیر حیدر شجر نے اپنے مقالے کے آخر میں علی ثنا بخاری صاحب کے مقالے کا حوالہ بھی دیا ہے۔انہوں نے اس مقالے سے استفادہ اپنی ضرورت کے مطابق کیا ہے۔طاہر عباس کے اعتراضات کے حوالے سے پروفیسر فتح محمد ملک کی کتاب ''سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر'' احمد سلیم صاحب کی مرتبہ کتاب سعادت حسن مر گیا، منٹو زندہ ہے''____اور ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر کی کتاب ''سعادت حسن منٹو، حقیقی و تنقیدی مطالعہ'' میں بھی ماخذات کی افراط نہیں ہے۔بلکہ ایک سوال یہ بھی اٹھایا جاتا ہے کہ ان دنوں مصنّفین قینچی چلا کر جو کتابیں مرتب کر رہے ہیں اور کسی مضمون نگار سے ان کے ادب پارے کی شمولیت کی اجازت تک نہیں لیتے کیا انہیں ''سارق'' قرار دیا جائے گا؟ اور کیا ''یونیورسل ٹروتھ'' کسی کتاب سے اقتباس کیا جائے تو اس کا حوالہ بھی ضروری ہے؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر زاہد منیر عامر دے سکتے ہیں۔منٹو پر علی ثنا بخاری صاحب کا مقالہ بے حد اہم ہے اور اوّلیت کا درجہ بھی رکھتا ہے۔انہیں چاہیے کہ اسے جلدی چھپوا دیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ استفادہ کر سکیں۔اپنے مقالہ ''منٹو کے طرفدار'' میں انہوں نے غلط فہمیاں رفع کرنے کی اچھی کاوش کی ہے۔اب اس پر انیس ناگی صاحب کو

روشنی ڈالنی چاہیے۔دونوں قانون کے شناسا ہیں اور تعزیراتِ پاکستان کو مقدمات کی سماعت کے دوران استعمال کرتے رہے ہیں۔

اداریہ میں یہ سوال بڑی دردمندی سے اُٹھایا گیا ہے کہ ''علم و دانش تو جیسے ہمارے معاشرے سے اٹھ سی گئی ہے اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹی کے سٹاف رومز میں علم و ادب کی بجائے تنخواہوں، قرضوں، پروموشنوں اور گریڈوں کے قصے چھیڑے جاتے ہیں۔'' اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ہندو پاک کی دانش گاہیں علم سے خالی ہو گئی ہیں اور اب ان میں کھوکھلے نام اور خالی باتیں باقی رہ گئی ہیں۔دُکھ یہ ہے کہ جن معمر ادیبوں کو نئے لکھنے والوں کے لیے مثال بننا چاہیے تھا وہ جونیئر ادیبوں پر گل دشنام نچھاور کرنے سے بھی باز نہیں آتے اور اپنے باطن کی تمام آلودگی سطح پر اُچھال دیتے ہیں۔یہ زوال کی گھڑی ہے۔آپ کی زندگی میں شاید تبدیلی رونما ہو جائے۔مجھے اپنی زندگی میں تو نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر انوار احمد کا ڈرامہ ''صفروں والا گھر'' میں نے متحرک صورت میں پڑھا۔یعنی اس کے کردار زندگی کی سطح پر چلتے ہوئے محسوس ہوئے۔ڈاکٹر روبینہ شاہجہان ☆ نے مظفر علی سید کی ترجمہ نگاری کو اس کی کلّیت میں پرکھا ہے۔یہ مقالہ ان کے مطالعے کا قیمتی حاصل ہے۔کیا یہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی میں پڑھاتی ہیں؟ اوصاف نقوی، قاضی حبیب الرحمٰن، حفیظ شاہد اور خاور اعجاز نے تازہ گوئی کی مثال قائم کی ہے۔خالد فتح محمد کا افسانہ ''وراثت'' اور احمد صغیر صدیقی کا ''توازن'' معاشرے کی قاشیں ہیں جن کی حقیقت متاثر کرتی ہے۔

(ڈاکٹر انور سدید۔لاہور)

رسید و اطلاع:

ڈاکٹر فرمان فتح پوری (کراچی)، اشفاق سلیم مرزا (لاہور)، ڈاکٹر علی ثنا بخاری (لاہور)، غلام حسین ساجد (لاہور)، افتخار عارف (اسلام آباد)، ناصر بخاری (اسلام آباد)، صفدر علی شاہ (سرگودھا)، ، ڈاکٹر خیال امروہوی (لیہ)، افتخار مجاز (لاہور)، ظفر اقبال نادر (عارف والا)، حصیر نوری (کراچی)، نکہت بریلوی (کراچی) فہیم شناس کاظمی (نواب شاہ سندھ)، ڈاکٹر روبینہ شاہین (پشاور)، ایم خالد فیاض (گجرات)، صابر عظیم آبادی (کراچی)، عارف ثاقب (لاہور)، خالد فتح محمد (گوجرانوالہ) فیاض حیدر (گوجرانوالہ) روش ندیم (راولپنڈی) ڈاکٹر ایم اسلم خان (ہری پور ہزارہ)، کاشف مجید (اوکاڑہ)، تنویر صاغر (لاہور)، احمد پراچہ (کوہاٹ) شہاب صفدر (ڈیرہ اسماعیل خان) فیروز شاہ (میانوالی)، جمشید ساحل (لیہ)، عامر سہیل (ایبٹ آباد)

☆ ڈاکٹر روبینہ شاہجہاں: استاد شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی، پشاور

بک شیلف

رانا غضنفر عباس کا تازہ شعری مجموعہ

''دستک''

ملنے کا پتہ: الحمد پبلی کیشنز، لاہور

افسانہ نگار محمد امین الدین کا نیا افسانوی مجموعہ

''کرداروں میں بٹی ہوئی کہانی''

ملنے کا پتہ: بی۲/ ۱۳۵-ای بلاک ۷ گلشن اقبال، کراچی

طاہر نقوی کا منفرد افسانوی مجموعہ

''دیر کبھی نہیں ہوئی''

ملنے کا پتہ: ادارہ ممتاز مطبوعات، کراچی

منفرد اسلوب کے افسانہ نگار حامد سراج کا تازہ افسانوی مجموعہ

''برائے فروخت''

ملنے کا پتہ: مثال پبلشرز، فیصل آباد

اردو، پنجابی اور انگریزی تخلیقات کا عالمی سلسلہ نمبر۳

حریمِ ادب (بورے والا)

مرتبہ: جاوید حیدر جوئیہ/سید تحسین گیلانی

افسانہ نگار، محقق اور کالم نگار جاوید اختر بھٹی کی مرتبہ کتاب

''اخوان الصفاء'' از مولوی اکرام اللہ

ملنے کا پتہ: کتاب دوست ریلوے روڈ، ملتان

شاعر اور کالم نگار رضی الدین رضی کے دلکش کالموں کا مجموعہ

''آدھا سچ''

ملنے کا پتہ: کتاب نگر، حسن آرکیڈ، ملتان کینٹ

معاصر شعر و ادب کا ترجمان کتابی سلسلہ نمبر۱۵

''دنیا زاد''

مرتبہ: آصف فرخی

صاحبِ اسلوب شاعر صابر ظفر کی تازہ شعری تصنیف

''پرندوں کی طرح شامیں''

ملنے کا پتہ: نواب پبلی کیشنز، راولپنڈی

محمد فیروز شاہ کا تازہ ترین شعری مجموعہ

''خواب پر''

ملنے کا پتہ: مثال پبلشرز، فیصل آباد